زاویے

ر عَلیگ

زاوی

زاوے

(تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

یاور علیگ

بار اول:۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء

مطبوعہ:۔ الواعظ پریس۔ لکھنؤ

قیمت:۔ بیس ۲۰ روپے

ناشر:۔

کتاب گھر۔ لکھنؤ

انتساب

اس پگھلتی ہوئی مومی شمع کے نام
جس کے ساتھ کبھی کبھی خود کو بھی پگھلتے ہوئے
محسوس
کیا ہے

یاورِ علیگ

تقسیم کار:

تہذیب و تربیت پبلیکشنز۔ ۴۔ رسی بٹاں۔ لکھنؤ ۳

ملنے کا پتہ

۱۔ مکتبہ دین وادب۔ امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ

۲۔ دانش محل۔ امن آباد۔ لکھنؤ

۳۔ اردو پبلشر۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ

'زاویئے' فن کی پرکھ کا ایک انداز

'زاویے' یاور علگ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے بیشتر مضامین میں اردو کے اہم اور مستند ادیبوں کی تخلیقی قدر و قیمت کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اصول تنقید کو فنی اور ادبی تخلیقات کی تعبیر و تشریح میں غیر جانبداری اور مکمل معروضیت کے ساتھ برتنا تقریباً اتنی ہی صلاحیت اور ریاضت چاہتا ہے جتنا کسی ادبی شہ پارے کی تخلیق۔ اردو میں تنقید کا وجود نقطہ موہوم ہو یا نہ ہو، عملی تنقید کے کامیاب نمونوں کی کمی ضرور ہے۔ اس کمی کے کئی سبب ہو سکتے ہیں۔ کبھی مصلحت، کبھی تعصبات، کبھی تخلیقی بصیرت کا فقدان اور کبھی محض مطالعے کا محدود ہونا۔ اور تنقید کا پورا دفتر، بیشتر دو انتہا پسندانہ نظریات کا آئینہ دار ہے، غیر مشروط توصیف یا مکمل تنقیص۔ کہیں کہیں انھیں دو نظریات ہی کی طرح عقلیت پسندی کی کسوٹی پر پورا اترنے والا ایک اور رجحان بھی اردو تنقید میں نمایاں نظر آتا ہے اور وہ ہے غیر منطقی اور مصنوعی توازن قائم رکھنے کا رجحان۔ اس افراط و تفریط میں ہمارے مخصوص مزاج، تہذیبی روایتوں اور تمدنی رویوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ تقریظوں اور مقدموں کے میدان سے ہم نے جست لگائی تو ادبی ہیجان انگیزی کے

دائرے میں آن پڑے اور اس جست و خیز میں فنکار اپنی پہچان اور تخلیق اپنی صحیح قدر و قیمت کے تعین کے انتظار میں سوکھتے رہے۔

یاور علیگ نے اپنی بیشتر تنقیدی مضامین میں اس افراط و تفریط سے ہٹ کر، ایک خالص معروضی اور بے لاگ انداز اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا نام بھی ان کے اس رویّے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ طے شدہ نتائج کے تحت اور اپنے بنے بنائے نظریوں کی تصدیق کے لیے نہیں لکھتے۔ اس لیے ان کا نقطہ نظر نہیں ہوتا بلکہ زاویۂ نظر ہوتا ہے۔ اپنے اس مجموعے میں انھوں نے ہم عصر فنکاروں کی شخصیت اور فن کا جائزہ بھی لیا ہے اور بیشتر ادیبوں کے مقام کو ازسرِ نو متعیّن کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں ان کا انداز نظر غیر جانبدارانہ اور معروضی اور لہجہ بے لاگ اور دو ٹوک رہتا ہے۔ یہ دو ٹوک لہجہ اس ادّعائی اور متکبّرانہ انداز بیان سے یکسر مختلف ہے جو ہمارے بہت سے بڑے ناموں کا طرّۂ امتیاز ہے۔ اپنے تنقیدی مطالعے کے دوران وہ تخلیق اور صاحب تخلیق دونوں کو خلوص، ایمانداری اور غیر جانبداری سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس عمل میں وہ جن تجربوں سے دوچار ہوتے ہیں ان کو صاف، واضح اور غیر مصنوعی انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ کسی ادبی مسئلے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، فتویٰ نہیں دیتے۔ کہیں کہیں اُن کی تحریر میں تکرار اور لہجے میں غیر ضروری کھردراپن نظر آتا ہے لیکن اسے ان کے مطالعے کے انداز کی Spontaneity کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی ان کے خیالات میں پہلے کی کہی ہوئی باتوں کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں۔ اور پچھلی آوازوں کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ اسے

آپ ان کے مطالعے کی وسعت کی دین بھی کہہ سکتے ہیں اور محض ایک اتفاق بھی۔ تاہم ان کے طرزِ فکر کی انفرادیت اور سوچنے کا اپنا ڈھنگ کم و بیش ہر جگہ موجود ہے۔ شبلؔی، رشید احمد صدیقی، ن۔م۔ راشد اور قرۃ العین پر اپنے مضامین انھوں نے ان ادیبوں کو سمجھنے اور ان کی تخلیقات کا معروضی جائزہ لینے کی خاص طور سے پر خلوص کوشش کی ہے۔

یا ور علیگ کے خیالات اور نتائج سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے مطالعے کی معروضیت اور نقدِ ادب کے سلسلے میں ان کے اخلاص کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔

عرفان صدیقی

فہرست

خطوط غالب۔ اردو نثر کے آئینہ میں

اردو کے ادب العالیہ میں بالعموم اور اردو نثر میں بالخصوص غالب کے خطوط بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ بالفرض غالب نے اردو ادب و شاعری کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا ہوتا ان کے صرف مکاتیب ہی فراہم ہوئے ہوتے تب بھی وہ زندہ جاوید تھے۔ جو جو حکیمانہ صلاحیتیں اور اشارے کلام غالب کا طرۂ امتیاز ہیں وہ سب اسی رکھ رکھاؤ کے ساتھ خطوط میں بھی موجود ہیں۔

غالب کی وفات کا سن ۱۸۶۹ء ہے اور پیدائش کا سال ہے ۱۷۹۶ء اس حساب سے غالب ۷۳ سال جیئے اگر ان کی اس زندگی میں سے ابتدائی ۱۰ سال قلم زد کر دیے جائیں تب بھی غالب کی ادبی زندگی کی عمر ۶۳ سال ماننا پڑے گی۔ حالی کی تحقیق کے مطابق غالب نے اردو میں خط و کتابت کی ابتدا ۱۸۵۰ء سے کی۔ یعنی غالب کے خطوط کے مجموعے اردوئے معلیٰ، عود ہندی یا دیگر نثری

کارنامے ان کی ۷۰ سال کی ادبی کاوشوں کا نچوڑ ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ان میں غالب کی زندگی کا عطر کھنچ آیا ہے۔

اگر غالب مغلیہ سلطنت کے عروج کے زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کی بڑی قدر و منزلت ہوتی اور شاید انھیں وہ کڑوے کسیلے گھونٹ نہ پینے پڑتے جو ان کا مقدر بنے۔ حالانکہ یہ کہنا غلط ہے کہ غالب نے زندگی عسرت سے گزاری۔ اگر ان کو وہ عیش میسر آگیا ہوتا جو امیر نواب کو نصیب ہوتا ہے تو یہ بھی ممکن تھا کہ ہم ان ادبی نشتروں سے محروم ہی رہ جاتے جو کلام غالب اور ان کے نثری کارناموں میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں اور جو انھیں تلخ۔ کڑوے اور کسیلے گھونٹوں نے عطا کیے ہیں۔ دراصل غالب کی زندگی اور اس کے نشیب و فراز ان کے فن کا وسیلہ بن گئے تھے۔

مکتوب نگاری کا آغاز سلطنت روما کے سایہ میں ہوا۔ پہلے پہل سسرو کے مکاتیب میں زندگی کی جھلکیاں اور اس عہد کے معاشرہ کی پرچھائیاں مل جاتی ہیں انگریزی زبان میں خطوط نگاری کی ابتداء ۱۵ ویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ اس زمانے کے خطوط نمونے کے خطوط ہیں جن سے کفن۔ کافور اور عود کی بو آتی ہے۔ ۱۷ ویں صدی کے بعد سے اچھے فنی، علمی اور ادبی اعتبار سے قابل قدر خطوط فراہم ہو جاتے ہیں۔ لیمب۔ شیلی۔ کیٹس اور بائرن کے مکاتیب انگریزی زبان و ادب میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور سے کیٹس کے خطوط پگھلتی ہوئی برف کی مانند ہیں جن میں کیٹس بذات خود برف کی طرح پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اردو نثر کے نوشہ غالب ہیں اور ان کی مکتوب نگاری دلہن ہے۔

نمائشی غازے اور رنگ و روغن سے مبرّا۔ یقیناً اردو میں خطوط نگاری کی باقاعدہ صنف کے لحاظ سے ابتدا کا سہرا غالب کے سر ہے۔ جیسا کہ خود غالب کا خیال ہے۔

"فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری ضعف
کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی

حرارت غریزی کو زوال ہے"

یہ خود غالب کا اعتراف ہے۔ اس اقرار کے بعد جو خطوط غالب نے لکھے وہ لازوال ہیں۔ غالب نے زندگی کو پرکھا۔ برتا اور جھیلا تھا۔ فکر۔ وجدان اور خیال کو سمو کر جو خطوط احباب کو لکھے گئے ہیں وہ قلم برداشتہ ہیں اور ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قطرہ پر گہر ہونے تک کیا بیتی تھی۔ غالب سے پہلے لوگ زندگی کو دور سے دیکھنے کے عادی تھے وہ اپنی کمزوریوں پر بے محابا مسکراتے دکھائی دیتے ہیں انھیں زندگی کرنے کا فن آگیا تھا ان کے منفرد اسلوب نے ان خطوں میں وہ بات پیدا کر دی ہے جو گرمیوں کی چاندنی میں ہوتی ہے ان کی تحریر کا بانکپن ایسا ہے جیسے بہادر کے ماتھے کی شکن۔ انھوں نے نظام نثر میں آب کوثر کی سی پاکیزگی۔ الفاظ کا رکھ رکھاؤ اور زیر و بم اور مزاج کی افسردگی سے بڑی شاندار نشاطیہ اور طنزیہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ان خطوں کی تہہ میں جذبات کی وہ گرم رو ہے۔ خون کی وہ روانی ہے جسے علم کہہ لیجئے۔ زندگی کے لطائف و کوائف اور موت کا ذکر اس انداز میں ملتا ہے کہ افسانوں سے بے پناہ محبت کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے اور یہی سچے اور لافانی ادب کا جوہر ہے۔

کچھ لوگوں نے غالب سے ان کی حیات ہی میں ان کے خطوط چھاپنے کی اجازت طلب کی تھی جس پر غالب برہم ہوئے تھے۔ اس بظاہر برہمی کا اظہار انھوں نے کچھ اس طرح کیا ہے۔

"میرے ذاتی خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں یہ زاید بات ہے کہ کوئی خط دل لگا کر اور قلم سنبھال کر لکھا ہوگا۔ ورنہ تحریر سرسری ہے جس کا طبع ہونا میری شاعری کی شہرت کے منافی ہے"

اور اس تحریر کے بعد سے ہی غالب کے خلّاق ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ گئی تھی کہ خطوط کا چھاپا جانا ضروری ہے اور بعد میں خطوط شائع کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی لیکن اس احساس کے بعد کے خطوط اپنے فطری پن سے عاری ہیں۔ ان میں یقیناً وہ خلوص اور برجستگی نہیں ہے جو ابتدائی خطوں میں ہے ان مراسلوں میں مکالمے کی شان مفقود ہے۔ غالب کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے اس احساس کے پیدا ہونے سے قبل والے خطوط پر تو صادق آتا ہے لیکن ان خطوط کے بارے میں یہ باطل ٹھہرتا ہے جو قلم سنبھال کر اور بالارادہ لکھے گئے ہیں اور اس مقصد کے پیش نظر لکھے گئے ہیں کہ چھاپے جائیں گے وہیں غالب کا یہ بیان "وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ہزاروں کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو" ادھوری سچائی معلوم ہوتا ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ خط جو قلم سنبھال کر لکھا جائے اس میں وہ شان پیدا ہو ہی نہیں سکتی جو بے تکلفی کے ماحول میں بغیر رنگ آمیزی کے لکھنے میں

پیدا ہو جاتی ہے۔ جس خط کے پس منظر میں اس احساس کی کارفرمائی ہو کہ یہ چھاپا جائے گا وہ اصلاً خط کے دائرے سے باہر کی چیز ہے۔ لوگوں کا یہ خیال کچھ عجیب اور بے تکا سا معلوم ہوتا ہے کہ اگر غالب نے خطوط قلم سنبھال کر لکھے ہوتے تو ان کی عظمت کا کیا حال ہوتا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، خطوط وہ اچھے ہوتے ہیں جو دوستانہ ماحول میں قلم برداشتہ اور بے تکلفی کے ماحول میں لکھے گئے ہوں۔ خط خودی کا آئینہ ہے خط اس تنہائی کا نام ہے جس میں ہم صرف ایک رازداں کو شریک کرتے ہیں اور خط کے پردے میں وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جو عام طور پر نہیں کہہ سکتے۔ خط ایک ذاتی شے ہے جسے ہم کسی دوسرے کو باتوں کی خوشبو میں بسا کر اور یادوں کی جوت جلا کر سونپ دیتے ہیں یہ ہدیہ اور نذرانہ جسے خط کا نام دیا گیا ہے ایک سماجی تحریر بھی ہے اور اگر اس سماجی تحریر میں ادبی رنگ بھی آجائے تو یہی سماجی تحریر ادبی شہ پارہ بن جاتی ہے۔ چھپوانے کی غرض وغایت سے لکھا جانے والا خط انشائیہ۔ تعریف نامہ یا اشتہار تو ہوسکتا۔ خط ہرگز نہیں ہوسکتا۔

غالب کے خطوط میں خوش مذاقی، شگفتگی اور بلا کی بے باکی ہے اسلوب بیان اس قدر صاف شستہ اور انداز بیان اس درجہ شفاف ہے کہ خواہ مخواہ دل میں کھب جاتا ہے اور دل میں اتر جاتا ہے۔ ان خطوں میں یونانیوں کی سی لطافتِ خیال ہے اور یونان کے سنگ تراشوں کی ایسی مصوری ہے۔ غالب ان مکاتیب میں نزاکت خیال کی آخری حدوں کو چھوتے نظر آتے ہیں ان کی بلا کی شوخ طبیعت نے اردو نثر کو باغ و بہار

بنا دیا ہے غالب خشک سے خشک مبحث پر بھی جب قلم اٹھاتے ہیں تو طرز بیان سے رنگینی پیدا کر کے ایسے ایسے نکتے نکال لیتے ہیں جن کی داد دیتے ہی بنتی ہے۔ غالب کی اس ادوئے خاصہ کی داد بہت ملی ہے ابھی اور ملنی ہے غالب کے دم سے اردو کی کمسن اور الھڑ نثر آج دنیا کی علمی و ادبی زبانوں کی نثر سے آنکھ ملا سکتی ہے غالب کی نثری تحریر کے نور سے اردو نثر کی بزم روشن ہے۔ غالب تمام عمر چراغوں کی طرح جلتا رہا موم کی شمع کی طرح پگھلتا رہا اور اپنے دور کی تمام فکر مندیاں اور تلخیاں اپنی شخصیت میں سموتا رہا اور آخر میں اردو نثر کو ایسی بلندیاں عطا کر گیا جس کے لیے یہ ایک مدت سے ترستی تھی۔ شخص یا ادیب کی شخصیت بھی ان کے خطوط میں برہنہ نظر آتی ہے۔

ان خطوں سے غالب کی کہانی ترتیب دی جاسکتی ہے جو انھوں نے اپنے دوستوں شاگردوں اور چاہنے والوں کو لکھے ہیں اپنا حلیہ ایک خط میں اس خوبی سے بیان کیا ہے

"میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا، اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے کیا کہوں جی پر کیا گزری جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مستی بھی چھوڑ دی اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا حافظ بساطی نیچہ بند دھوبی بھٹیارا جولاہا کنجڑا منھ پر

پر داڑھی سر پر بال فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اس دن سر منڈوایا"

غالب کا زمانہ اور ماحول آشفتہ سری اور افراتفری کا تھا غالب نے جن آنکھوں سے زندگی کی ساری کامرانیاں دیکھی تھیں۔ انھیں آنکھوں سے انھیں دلّی کی تباہی، ویرانی۔ لوٹ مار۔ غارت گری۔ شرفا کی بے حرمتی اور بہادروں کے فرسودہ عزائم بھی دیکھنے پڑے تھے۔ غالب نے ماحول کا اثر قبول کیا اور اس پر اپنا اثر بھی ڈالا۔ وہ اپنے ماحول کے خالق بھی ہیں اور مخلوق بھی۔ ماحول کے تلخ اور ترش اثرات کو کم کرنے کے لیے انھوں نے اپنی شدّت احساس اور قوتِ ادراک کو وسیلہ بنایا اور اسی لیے مایوس کن حالات بھی انھیں مغلوب نہیں کر پاتے برخلاف اس کے حوصلہ ہی بخشتے ہیں۔ وہ پانی کے بلبلہ کی طرح ایکدم سے پھوٹ نہیں پڑتے ان کی شکایت میں شکر ہے تخریب میں تعمیر مضمر ہے۔ یاس میں آس بھی ہے فسردگی میں توانائی کی جھلک ہے۔ غالب کے یہاں قنوطیت اور بیچارگی پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں ان کے یہاں شکستِ آرزو حاصل لطف ہے واقعہ بیانی۔ نے فن اور خیال کے ہاتھ سے کاسۂ گدائی چھین لیا ہے۔ ارادے کی پختگی اور عقیدے کی استواری نے ان کی شخصیت میں جان ڈال ڈالی ہے اور ان کے فن کو معراج عطا کر دی ہے۔ نثر میں غالب کی عظمت کا سارا بھرم ان کے ذاتی خطوط سے قائم ہے وہ غالب ہی ہیں جنھوں نے شاید سب سے پہلے خطوط میں بے جا طوالت اور مضمون آفرینی سے گریز کیا ہے فرسودہ رسم و رواج کو ختم کر کے سادگی اور سلاست پر توجہ دی ہے زبان کی دلکشی اور شگفتگی کو سلیقے سے برقرار رکھا ہے غالب یوں تو صوفی بھی ہیں۔ فلسفی

بھی — رند بلانوش بھی ہیں اور قدر اول کے شاعر بھی لیکن ساتھ ہی قابل اعتماد انشاپرداز بھی ہیں اسی لیے شبلی نے لکھا ہے "کہ وہ جس راستے پر چلتے تھے اپنے لیے نیا کوچہ نکال لیتے تھے چنانچہ جس طرح انھوں نے غزل میں الگ راستہ اختیار کیا اور صاحب طرز قرار پاتے۔ اس طرح انھوں نے مراسلہ نگاری کے فن میں اسلوبِ نگارش یادگار چھوڑ" اس صداقت سے انکار ناممکن ہے۔

اردو میں ظرافت کا آغاز غالب سے ہوا۔ یہ ظرافت پاکیزہ ہے عجب نکھار لیے ہوئے اس میں خیال وفکر کی بلندی بھی ہے اور زیر لب تبسم کی شان محبوبی بھی بقول اقبال سے

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر

ایک ذرا دیکھیے :۔ دیکھئے صاحب ہمیں یہ باتیں پسند نہیں ہیں ۵۸ کے خط کا جواب ۵۹ میں دیتے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو کہو گے کہ میں نے دوسرے روز جواب لکھا۔ تم بھی سچے میں بھی سچا۔

غالب کے خیالات زندگی کی چھیڑ سے جاگے ہیں زندگی کی آنچ میں تپ کر کندن بنے ہیں غالب کے فن میں مستقبل کا اشارہ ہے اسی لیے وہ موجودہ عہد میں بھی آنکھیں چار کر سکتے ہیں اور آئندہ بھی ان کے جلائے ہوئے چراغ سے چراغ جلتے ہی رہیں گے۔ غالب نے حقیقتاً تمام فرسودہ روایات کو قلم زد کر کے مکتوب نگاری کا پورا ڈھانچہ ہی بدل دیا ہے تصنع اور تکلف نے سادگی اور سلاست کا لبادہ اوڑھ کر سادہ نثر کی شکل میں خطوط کے ذریعے ایسی جلوہ

نمائی کی ہے جس کی مثال اردو نثر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ غالب نے آخری دور کے خطوط کو چھوڑ کر باقی تمام خطوط میں جگر کاوی اور محنت پژوہی بالکل نہیں کی ہے اور اسی میں غالب کے اسلوب کی انفرادیت کا راز مضمر ہے اور اسی لیے یہ خطوط جب ان کے دوست احباب پڑھتے ہیں تو لطف اندوز ہوتے ہیں، غمگین اور افسردہ ماحول کے باوجود غالب ایسی بات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ ماحول شگفتہ ہو اٹھتا ہے غم کے دھارے رک سے جاتے ہیں غالب کے خطوط دلچسپی کے سرچشمے اور ادبی مرقعے ہیں اور بقول حالی" ان کی شوخی میں ستار کے تاروں ایسے سُر بھرے ہیں۔ ایک ذرا برسات کا ذکر ملاحظہ فرمائیے:

" دیوان خانے کا حال محل سرا سے بھی بدتر ہے۔ مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں چھت چھلنی ہو گئی ہے ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے "

ایک ذرا سی ترکیب لفظی سے ایک چھوٹے سے جملے سے غالب وہ بات پیدا کر دیتے ہیں جو دوسروں کے لیے صفحات میں بھی ممکن نہیں۔ آدمی گھنٹوں سر دھنتا ہے ان کی خوبی یہ ہے کہ یہ خطوط ہیں۔ یہ خطوط اپنوں کو بھی لکھے گئے ہیں، عزیزوں کو بھی اور دوستوں کو بھی اور ان کو بھی لکھے گئے ہیں جن سے ان کی ملاقات غائبانہ تھی ان سب میں لکھنے کی بات کہنے کی زبان میں سلیس طریقہ سے سلیقہ کے ساتھ کہہ دی گئی ہے جو خطوط بے تکلف دوستوں کو لکھے گئے وہ بہت ہی اہم، قیمتی اور خاصہ کی چیز ہیں ان میں خلوص کا رنگ زیادہ ہی گہرا ہے دل کی بات دل کی زبان میں سادگی کے ساتھ ادا کرنا کوئی غالب سے سیکھے

اور ان ہی میں غالب کی شخصیت نمایاں طور پر سامنے آگئی ہے۔ یہاں غالب غیر شعوری طور پر وہ وہ باتیں کہنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو وہ کسی سے کہہ نہ سکتے تھے۔ یہاں لاشعور کا وہ چور بھی جو گھات میں رہتا ہے دکھائی دے جاتا ہے یعنی آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا غالب کے نہاں خانۂ دل میں اترنا ہے تو ان کے اُن خطوط کو پڑھیے جو انھوں نے اپنے بے تکلف دوستوں کو لکھے ہیں

خطوط شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں اور شخصیت کی ضد بھی۔ غالب کے خطوط شخصیت کا آئینہ ہیں اور شبلی کے خطوط شخصیت کی ضد۔

"یہاں خدا سے بھی توقع نہیں مخلوق کا کیا ذکر کچھ بن نہیں آتی آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو غیر تصور کیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں آج دور دور تک میرا جواب نہیں"

"کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک فشانی کہاں کی مرثیہ خوانی آزادی کا شکر بجا لاؤ غم نہ کھاؤ اگر ایسے ہی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی سنا جان ہی سہی جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا ایک حور ملی اقامت جاودانی ہے اسی نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منھ کو آتا ہے ہائے ہائے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی وہی زمردیں کاخ اور

وہی طوبیٰ کی ایک شاخ چشم بد دور وہی ایک حور بھائی ہوش میں آؤ
کہیں اور دل لگاؤ"

برخلاف اس کے شبلی کی عاشقی جو ان کی ذات تھی خطوط کے ذریعے ان کی صفت بن گئی عمل اور آیڈیل کا ٹکراؤ۔ آرزو کی کشمکش اور خیر و شر کی آمیزش نے شبلی کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ لوگوں نے ان کو مرد بد بیں اور رند پارسا تک کہہ ڈالا اور کچھ لوگوں نے عطیہ کے نام .... کی آڑ لے کر الفاروق سیرۃ النبی۔ شعر العجم جیسی عظیم تخلیقات پر بھی پانی پھیرنے کی کوشش کی ندوہ کی ساری کاوشوں پر خاک ڈالنے کی ناکام کوشش کی گئی ثبوت میں خطوط کو پیش کر دیا۔ یہ ہے شخصیت کا تضاد۔

غالب کے خطوط میں بشریت کی واضح اور صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے انھوں نے رنج و غم سے خوشی کا بھرم قائم رکھا ہے انھیں اپنے زخموں پر بھی ناز ہے خطوط غالب اگر اک طرف نجی یا تاریخی معلومات کا گنجینہ ہیں تو دوسری طرف انشا پردازی اور اسلوب کا بہترین نمونہ ہیں۔ عدم کو وجود میں لانے۔ نہیں کو ہاں میں بدلنے اور کچھ نہیں ہے سے کچھ تو ہے کا معجزہ دکھانے میں غالب اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں خط اپنی باتیں خود پیدا کرتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے زندگی اپنی راہیں خود بناتی ہے خط حسن اتفاق کا نام ہے اور حسن اتفاق سے ہی یہ ادب کی ایک صنف بھی قرار دے دی گئی ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے غالب نے وہ خاکے بنائے ہیں جن میں زندگی کا لطف ہے یہاں اصول۔ خیال، موضوع کسی کی ضرورت نہیں ہے زندگی کے دامن سے قیمتی

لمحوں کو اپنی گرفت میں لے کر اور انھیں خطوط کی شکل دے کر اپنے دوستوں اور رازداروں میں تقسیم کر دیا ہے غالب روتے بھی ہیں، قہقہے بھی لگاتے ہیں خوبی یہ ہے کہ قنوطیت پر وعظ نہیں کہتے اور قہقہوں پر کوئی مضمون نہیں لکھتے۔ ان کے خطوں میں حکومت کا زوال ہے۔ نزاکتِ خیال ہے خلوص کی آنچ ہے، اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ جہاں وہ خود ہیں وہاں آپ بھی پہنچ جاتے ہیں غالب کے یہاں وہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، زندگی جن سے عبارت ہے یہاں زندگی اس کا لطف اور وہ سب کچھ ہے جو خط میں واقعی ہونا چاہیے۔ غالب کی نثر عجیب شان رکھتی ہے اردو نثر کا مستقبل فورٹ ولیم کالج سے منسوب نہ کر کے قلعۂ معلیٰ سے منسوب کرنے کو چاہتا ہے غالب جدید اردو نثر کے امام ہیں غالب کے قلم کے دھارے کا سوت جاری رہے گا۔ خطوط نگاری کی راہ میں اس چراغ سے بہت سے چراغ جل سکتے ہیں اور اردو نثر میں ایک نئی شان پیدا ہو سکتی ہے جدید نثر کی بنیاد رکھنے والے سب ہی غالب سے متاثر ہیں اور اسی تاثر نے اردو ادب میں نثر کے چھپے ہوئے امکانات کو روشن و تابندہ کرنے میں مدد دی ہے۔ حالات بدلیں گے حالات بدلے بھی ہیں مگر اتنے فرق کے ساتھ کہ پہلے غیروں سے شکایت تھی اب اپنوں سے گلہ ہے حق تلفی اپنی جگہ پر ہے گلہ۔ شکوہ اور حق تلفی سے متاثر ہو کر اگر ہم اپنا لٹریچر بھی کھو بیٹھے تو مستقبل ہمیں معاف نہیں کرے گا ڈر ہے کہ ادبی حیثیت سے ہماری یہ پسپائی واقعۂ عبرت نہ بن جائے اگر ہم نے غفلت برتی تو ہماری اردو انتشارِ ذرات کی حیثیت سے قوی تر عناصر میں جذب ہو جائے گی۔ ہم ظاہرا بہت کچھ ابھرتے نظر نہیں آتے

اگر ہمارے ظاہری ٹھاٹ پر ہماری دماغی آرائش غالب آجائے تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اعلیٰ لٹریچر کے حقوق کیا چاہتے ہیں۔ اگر ہم نے یہ جان لیا تو اردو کا ادبی رنگ روپ نکھر سکتا ہے اور ہم وقت کے اقتضا کو نظر میں رکھ کر محدود دائرے سے نکل سکتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں نظم و نثر دونوں کو رونا پڑے۔ آج اردو ادب اور خاص طور سے اردو نثر منتظر ہے ان کی جو غالب کے فن کو آگے بڑھا سکیں۔ اور قومی مزاج کی ادب سے تعمیر کر سکیں۔

مہذب انسانیت کا معتبر شاعر۔ اقبال

اقبال کو اگر خانوں میں بانٹ کر دیکھا جائے گا تو غالباً اقبال تو مٹ جائیں گے صرف خانے ہی خانے رہ جائیں گے ہر دیکھنے والے نے اقبال کے آئینہ میں اپنی ہی تصویر دیکھنا چاہی ہے۔ اقبال فرشتہ نہیں انسان تھے ایک ایسا انسان جس میں خامیاں بھی تھیں اور کمزوریاں بھی تاہم اقبال کا پیش کردہ تصوّر لائق احترام ہے۔ وہ مہذب انسانیت کے عظیم شاعر تھے فلاسفر بھی اور سچے رہنما بھی کاش اقبال کی تمام تر تخلیقی صلاحیتیں اردو شاعری کے لیے وقف ہو جاتیں۔

اقبال کی زندگی اور ان کے غیر فانی کلام کے تقریباً ہر پہلو پر بے شمار مضامین تراجم اور مستقبل کتابیں شائع ہو چکی ہیں اقبال پر لکھنے والوں نے ان کی تاریخ کے نئے نئے گوشے ڈھونڈھ نکالے ہیں۔ ان میں سب ہی اقسام کے لوگ ہیں

جنھوں نے صرف اقبال ہی پر لکھ کر اردو ادب میں اپنا مستقل مقام بنا لیا ہے۔ اور ایسے بھی ہیں جو کلام اقبال کو وحی والہام سمجھ کر سینے سے لگاتے ہیں اور ملکوں سے چومتے ہیں اور پاکستان نے تو اپنی قومی سیاست کی فکری اساس ہی کلام اقبال پر رکھنا چاہی تھی لیکن اسے اس میں بھی کامیابی نہ مل سکی۔

اقبال نے ۴۰ سال قبل اس دنیا کو خیرباد کیا تھا۔ یعنی تقسیم ہندوپاک سے تقریباً ۱۰ سال پہلے اپنے آخری دو سالوں میں پنجاب مسلم لیگ میں حد سے زیادہ دلچسپی کے اظہار نے ان کی قدر و قیمت پر کسی حد تک بٹہ لگا یا۔ مسٹر جناح کی مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں اقبال نے بھی تعاون دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ سوشلزم کے اصول انھیں پسند آگئے تھے یہ اور ایسی ہی کچھ دیگر وجہوں سے کتنی ہی غلط فہمیوں کے لیے دروازے کھلے اور نتیجے میں تقسیم ملک کے بعد پاکستان نے اقبال پر اپنا حق جتا کر انھیں ہم سے چھیننے کی ناکام کوشش کی۔

اردو اور اقبال دونوں کے وقار کو قیام پاکستان سے کافی صدمہ پہنچا۔ وقتی طور پر اس تنگ نظری کی لپیٹ میں اردو بھی آگئی اور اقبال بھی۔ لیکن نہ اردو محدود ہو سکی اور نہ اقبال ہی کو ہم سے چھینا جا سکا۔ اردو اور اقبال دونو سمندر ہیں اور سمندر پر روک لگانا محض نادانی ہے۔

اقبال پکے اور سچے مسلمان تھے اگر وہ مسلمان نہ بھی ہوتے تب بھی ان کی عظمت اس وجہ سے کم نہ ہوتی وہ ملٹن کی طرح دنیا کے عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ اقبال غدر سے تقریباً ۲۰ سال قبل سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ کشمیری برہمن خاندان سے ان کا اٹوٹ رشتہ تھا۔ اسلیے کشمیری ذہانت

اور ذوق جمال انھیں ورثے میں ملا تھا۔ مذہبیت چونکہ پورے خاندان پر حاوی تھی اس لیے بھلا وہ اس رنگ سے بچ بھی کیسے سکتے تھے۔ میر حسن نے ابتدا میں اقبال کو فارسی سے روشناس کرا کے اتنا پختہ کر دیا تھا کہ بعد میں اسی زبان کو انھوں نے اپنے پیغام کا ذریعہ ٹھہرایا تاکہ دنیا بھر کے مسلمان ان کے پیام کو سمجھ سکیں ابتدا میں اقبال کو اردو میں اتنی وسعت فطرتہً آئی تھی کہ وہ ان کے پیام کا ذریعہ بن سکتی۔

اقبال نے جب ہوش سنبھالا تو خود لاہور کالج میں پایا۔ جہاں انھوں نے بڑے شغف و انہماک کے ساتھ ارنلڈ سے فلسفہ پڑھا اور ان ہی کے توسط سے اقبال انگریزی کے رومانوی شاعروں سے بھی متعارف ہوئے جنھوں نے بعد کو اقبال کے شعری مزاج کو جلا بخشی۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج سے ایم اے کرنے کے بعد اقبال کچھ دن وہیں بحیثیت استاد درس دیتے رہے اس کے بعد انگلستان گئے، وہاں بیرسٹری کی ڈگری لی اور فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کیا گورنمنٹ نے بطور قدردانی سر کے خطاب سے نواز کر عزت افزائی کی۔

اس وقت اردو شاعری میں داغ غزل کا چراغ جلاتے ہوئے تھے لیکن اس کی روایت کا اٹھتا ہوا دھواں بتا رہا تھا کہ شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا ہی چاہتا ہے۔ سر سید تحریک زوروں پر تھی۔ مشرقیت پر ترقی پسندی کا روغن چڑھتا ابھی باقی تھا۔ وطنیت کی طرف رجحان بڑھنے لگا تھا۔ حالی کی لے کچھ دردمندوں کو گرمانے لگی تھی اقبال کا ان سب سے اثر قبول کرنا فطری بھی تھا اور وقت کا اہم تقاضہ بھی۔

اقبال کی ابتدائی اردو شاعری پر رومانیت کی گہری چھاپ ہے۔ یہ اس رومانونیت سے مختلف ہے جو بعد میں اردو میں رومانوی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہاں اقبال انگریزی ادب سے زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے اس ابتدائی کلام میں جستجو، تڑپ، تلاش، حیرت اور گرمی صاف بتا رہی ہے کہ اقبال انگریزی کے رومانوی شاعروں اور غالب کی شوخیٔ فکر پر دل و جان سے فدا ہیں۔

ہمالیہ۔ ترانۂ ہندی۔ نیا شوالہ۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت تصویر درد وغیرہ نظموں کو اقبال کے ذہنی بچپن کی تصویریں کہہ کر نظر انداز کرنا فنی بد دیانتی ہے اقبال پر لکھنے والوں میں بیشتر نے بانگ درا کی ابتدائی نظموں پر حرف زنی کر کے اور کم تر کہہ کر اردو شاعری میں ان کے رتبے کو کم کرنے کی شعوری کوشش کی ہے جسے کم نظری پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے اقبال خود بھی فارسی پر جان چھڑکتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کا ابتدائی اردو کلام حرفِ غلط ہے یا اس میں معنویت۔ گیرائی اور مقصدیت کی کمی ہے یا اس میں کوئی پیام نہیں ہے بلکہ فارسی کو اپنانے کا تو مطلب تھا اپنے پیغام کی وسیع ترسیل۔ اردو تاریخ شعر و ادب میں غالب اور اقبال جیسی قدر شناسی بہت ہی کم شعراء کو نصیب ہوئی ہے یہ دونوں ہی اردو کے خوش بخت۔ ہر دلعزیز مقبول ترین اور معتبر شاعر ہیں۔

اقبال کی آواز ان کی حیات ہی میں دوسرے ممالک تک پہنچ گئی تھی، ثبوت میں ان کے کلام کے وہ تراجم پیش کیے جا سکتے ہیں جو عربی، فارسی، انگریزی

روسی، فرانسیسی، اطالوی، جرمن، اسپینی، چیک، ترکی، گجراتی، مرہٹی، بنگالی، پشتو اور سندھی میں ہو چکے ہیں۔ اسرار خودی کا پہلا انگریزی ترجمہ خود اقبال کے استاد نکلسن نے کیا تھا اور یہ بڑی بات ہے اقبال کو مترجم بھی جید عالم اور قابل ملے۔

عبدالوہاب عزام (عربی)، انیما میری شمیل (جرمن)، الی ساندرو ولسانی (اطالوی) یان یارک (چیک)، آربری (انگریزی) اور ان سب کا آفاقی ادب میں اپنا اپنا منفرد مقام ہے۔

شاعر مشرق شاعر اسلام محض ماضی پرست اسلامی سوشلسٹ۔ آفاقی شاعر اور نہ جانے کتنے خطابوں سے اقبال کو نوازا گیا ہے کچھ ہی ہی اقبال اور غالب اردو ادب میں اسی حیثیت کے مالک ہیں جس حیثیت کے انگریزی ادب میں چاسر اور شیکسپیر۔ فارسی میں خیام وحافظ اور بنگلہ میں ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام۔

اقبال کو نوبل پرائز نہ مل سکا۔ ٹیگور نے اسے حاصل کر لیا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اقبال پر اسلام غالب رہا۔ اسلام کی روحانی اقدار ان کے رگ و ریشہ میں اس طرح رچ بس گئی تھیں کہ انھوں نے عالمگیر انسانیت کا تصور اسلام کی حدود ہی میں رہ کر گیا۔ ان کے اس تصور سے اسلامی اخلاقی قدریں پامال نہیں ہوتیں۔ اسلامی ملت کے تصور کی زنجیروں میں ان کی شاعری جکڑی ہوئی ہے۔

اقبال مسلمانوں کی بے علمی اور تن آسانی سے ہراساں تھے وہ نفرت، سستی بزدلی، غیر یقینی پن اور ڈسپلن کے فقدان کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ ترقی تبدیلی تغیر اور بہتری پر زور دے کر وہ مسلمانوں کو انسان برابری خوش حالی اور سکون

کی دولت سے مالا مال دیکھنا چاہتے تھے یعنی خوف وکمزوری پر ہمت اور جرأت کو فتحیاب دیکھنا چاہتے تھے۔ اقبال کو حال کا احساس اک کرب کے ساتھ ملا تھا اور یہ کرب تھا ماضی کا وہ المیہ جس سے مسلمان دوچار ہو گیا تھا۔ خوف مایوسی اور بے عملی کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے انھوں نے شاعری کو اپنا وسیلہ بنایا اقبال کا بھروسہ تھا انسانیت پر ان کا مرد مومن بے خوف باعمل قوت کا مظہر، توانا۔ آخرت پر ایقان رکھنے والا اپنے اوپر اعتماد کرنے والا اور اپنی پوری قوت۔ توانائی اور طاقت کا احساس کرکے پوری زندگی کو عمل کے سانچے میں ڈھالنے والا ہے۔ ان کے پیام کی گرمی اور روشنی منزل کی صحیح سمت کا تعین کرتی ہے اور منزل کی سمت برابر بڑھتے رہنے کی آرزو کی غمازی کرتی ہے۔

اقبال کے یہاں شاعری لذت خط۔ دلچسپی کا سامان تفنن طبع اور دل بہلاوا نہیں ہے۔ انھوں نے شاعری کے ذریعے انسانی دل و دماغ کو بدلنے اور ان پر صیقل کرنے کا تعمیری کارنامہ انجام دیا۔ شاعری سے انسانی فلاح کا کام اقبال نے بڑی چابک دستی کے ساتھ لیا ہے۔ اردو شاعری کو اقبال نے فکر و فلسفہ اور مقصد دے کر فنون لطیفہ میں شاعری کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے اگر اقبال نہ ہوتے تو برہمن بت خانے کے دروازے پر سوتا رہتا اور مسلا تہہ محراب اپنی تقدیر کو روتا اور کوستا رہتا۔ اقبال نے ہندی مسلمانوں کو اپنا سوز دے کر بڑا عظیم احسان کیا ہے۔

شبلی کی شخصیت خطوط کی روشنی میں

دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کی طرح اردو میں بھی بہترین مکاتیب ان انسانوں کے ہیں جن کی زندگیاں خالصتاً علمی وادبی تھیں۔ خطوط کے ذریعہ انسان کی شخصیت برہنہ ہو کر سامنے آجاتی ہے اگر اس ادھوری یا پوری سچائی کو تسلیم کر کے شبلی کی شخصیت کو ان کی روشنی میں تلاش کیا جائے تو بہت سی ایسی پوشیدہ حقیقتیں اور سچائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ جو شخصیت کی مکمل تعمیر میں مدد دیتی ہیں اگر شبلی کے یہ خطوط نہ فراہم ہوئے ہوتے تو ان کی زندگی کے بہت سے اہم گوشوں پر دبیز غلاف ہی چڑھا رہتا۔ یہاں شبلی کی شخصیت کی تشکیل ان کے فراہم کردہ کچھ مکاتیب کی حدود میں رہ کر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شبلی ایک ایسا خط تھے جو ایک انقلاب میں کھینچا گیا اور دوسرے انقلاب میں مٹ گیا۔ شبلی کو وہ ماحول ملا جو انتشار و پراگندگی کا مرقع تھا۔ انگریزی

تمدن کی نئی قدروں پر لوگوں کے بڑھتے ہوئے اعتماد نے پرانی اقدار کو عقل کی عینک سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اخلاق اور معیارِ اخلاق کی تبدیلی سے معاشرت اثر پذیر ہو رہی تھی اور روزمرہ زندگی بدل رہی تھی۔ کچھ لوگوں نے زمانے کے سامنے سپر ڈال دی اور جیت گئے۔ پرانی زندگی شبلی کے لیے صداقت تھی انھیں ماضی اور اس کی اقدار و روایات سے بے پناہ لگاؤ تھا اور انھیں پر وہ حال کی تعمیر بھی کرنا چاہتے تھے کیونکہ حال کی زندگی پر انھیں بھروسہ نہ تھا، یا پھر وہ شک و شبہات سے اپنے دماغ کو پراگندہ کرنا نہ چاہتے تھے۔ وفاداری بشرطِ استواری کے اصول پر وہ انگریزوں سے بس اتنا سیکھنے کی اجازت دے سکتے تھے تاکہ شاہراہوں پر لگے بورڈ پڑھے جا سکیں۔ بینک میں روپیہ جمع کرنے میں تکلیف نہ ہو اور فارم وغیرہ بھر کر تھوڑی سی کاروباری شُدبُد آجائے وہ نئے علوم کے تباہ کن سیلاب کو روکنا چاہتے تھے انھوں نے پرانی روایتوں کو من و عن قبول کر لیا اور زمانے سے ہار گئے۔ ایسے وقت میں ندوہ ان کی فاش غلطی تھی جس کا خمیازہ انھیں زندگی ہی میں بھگتنا پڑا تھا۔ ندوہ کے بانی کی حیثیت سے شبلی ناکام ہیں۔

ان کے خطوط میں عظمت کا شعور ہے۔ روح و بدن کے لطائف و ظرائف ہیں۔ کہیں ستاروں پر کمندیں بھی ڈالی گئی ہیں۔ کہیں ایسی پرواز ہے جو فرشتہ سے لاگ کھاتی ہے۔ مذہب، فلسفہ، اور رسوم سے ہٹ کر وہ رومانیت بھی ہے جو شبلی کو بھرپور انسان ثابت کرتی ہے۔ یہ یونانی نژاد مصور عطیہ فیضی کے خطوط میں اپنی عبادت کرتا نظر آتا ہے جہاں بدن کی باریک نیں اور اس کے حسین

نشیب و فراز۔ دنیا پرستی اور نفس پرستی ہے جو عرفان کی گمرہی سے پیدا ہوئی ہے۔ ان کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی میں فرشتہ اور انسان کی ملی جلی خصوصیات بھی ہیں اور زندگی سے حظ اٹھانے کی بے پناہ صلاحیت بھی۔ یہ ان کے اچھے انسانی پہلوؤں کے آئینہ دار ہیں جنہیں پڑھ کر ان کے بے پایاں خلوص کا قائل ہونا پڑتا ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر شبلی مولوی نہ ہوتے تو کافی ترقی پسند ہوتے۔

شبلی کے خطوط علی گڑھ اور دیوبند سے متعلق بھی ہیں۔ ان میں ندوہ کے نقوش بھی ہیں۔ خانگی زندگی کی جھلکیاں بھی ہیں۔ یہاں سیرت پر مکالمات اور شعر العجم پر مباحث بھی ہیں۔ کتابوں کی بازیافت اور دریافت پر مسرت کا اظہار بھی ہے۔ تنقیدی اشارات بھی ہیں۔ دوستوں سے سرگوشیاں بھی ہیں اور عزیزوں کے لیے سفارشی خطوط بھی ہیں۔ کچھ خطوط حبیب الرحمان خاں شروانی نواب علی حسن، مولوی عبدالسمیع اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام بھی ہیں اور کچھ دوسرے بزرگوں اور ہمعصروں کے نام۔ یعنی پس پردہ جلوؤں کا اژدہام ہے۔ اور روشنیوں کی یلغار ہے یہ ہمارے قومی اعمال نامے ہیں آخر آخر عطیہ فیضی کے نام خطوط ہیں جو خاصہ کی چیز ہیں اور اگر کہیں یہ خطوط انھوں نے عالم شباب میں تحریر کیے ہوتے تو ہماری زبان میں نئی وادیاں اور نت نئی راہیں کھل گئی ہوتیں۔ آیئے اب خطوں کی سیر کریں۔ یہ انگریزی خواں فرقہ ہے۔

" انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے مذہب کو جانے دیجئے۔ خیالات کی وسعت۔ سچی آزادی۔ بلند ہمتی۔ ترقی کا جوش برائے نام نہیں بس خالی

کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی۔اے کی بہ نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے —
لاحول ولا قوۃ وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے"۔

یہ محض الفاظ ہیں اور ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ اس کا مقصد قوم کو نیک نیتی کے ساتھ فریب میں مبتلا کرنا ہے۔ رہی زمین کی حرکت ارتقائے حیات اور نظریۂ اضافیت اور حیوانیات کی بات تو ان کا فرقہ ہی اس سے کہاں واقف ہے۔ شبلی کی بھی اس سلسلے کی ساری منطق یا تو تفصیلات پر مبنی ہے یا ترجموں کی رہین منت ہے اس جہل فرقے کے بارے میں ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"آپ سنئے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے صبح ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو اس پر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے الصلوٰۃ خیر من النوم۔ پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں کیا شان ہوتی ہو دل پھٹا پڑتا ہے مجھ کو اس بات کا فخر ہو کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوشش مذہبی کا برانگیختہ ہونا میری قسمت میں لکھی تھا"۔

یہاں پول کھل گئی۔ قلعی اتر گئی۔ یعنی یہ کہ وہ نئے علوم سے نفرت نہ کرتے تھے لیکن نماز جماعت کے نظارے سے خدا کی عظمت و جبروت کو از سر نو کامران و فتح مند دیکھنا چاہتے تھے ان کی آرزو تھی۔ کہ صبح کو قرآن

خوانی کی آواز لحن کے ساتھ ہر چہار طرف اس طرح گونجے کہ درندوں پرندوں آبشاروں اور جھرنوں کی آوازیں ماند پڑ جائیں۔ سمندر کی موجیں اور پہاڑوں کی سربلند چوٹیاں سرنگوں ہو جائیں ماضی اپنی پوری توانائی کے ساتھ زندہ ہو جائے اور قدیم محلات چشموں کی مانند ابل پڑیں اور سورج زمین کے طواف پر مجبور ہو جائے۔

شبلی کے اس حسین خواب میں کتنی ہیبت اور کیسا جلال ہے ان کے اعصاب کی اعصاب شکن سرگرمیاں مچلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شبلی علی گڑھ میں ایک عمر گزارنے کے بعد بھی اس کے نقطۂ نظر کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ نئی بصیرت کی کمی کی وجہ سے وہ نئے زمانے کا تجربہ کرنے میں بھی ناکام رہے ان کے خیالات میں تضاد تھا اور مزاج میں دورنگی۔ لیکن وہ ریاکار نہ تھے۔ الفاروق اور شعر العجم کے مصنف نے عطیہ کو خطوط بھی لکھے ہیں۔ ابو حنیفہ کی سوانح عمری کے ساتھ انھیں بمبئی کا ساحل اور اس کے کھلے ہوئے بازو بھی یاد رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی راتیں ہمیشہ تصوراتی محلوں میں گزاریں۔ ان کی نمازیں لذت اور اصول کی نمازیں ہیں۔ ان کی جوانی کی سرمستی اور مدہوش کیفیات کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ عہد جہانگیری میں پیدا ہوئے ہوتے۔ کیونکہ ان کا مزاج شاہانہ تھا اور ان میں زندگی کی پرستش کا جذبہ تھا۔ عطیہ کے خطوط میں ہوس اور لطافتیں پوری طرح پیوست تو نہیں ہو پائی ہیں اس لیے کہ وہ ایک عمر گزارنے کے بعد لکھے گئے ہیں لیکن ان میں ایک صحت مند جذبہ ہے جس کی رو میں دھیمی مہک ہے ان تحریروں میں شراب کا سا تیز نشہ اور ہلکا رنگ ہے وہ اپنے آپ سے محبت

کرتے تھے اس لیے عورتوں سے بھی بے پناہ لگاؤ رکھتے تھے۔ پیری میں شباب کی بیداری نے ان کے متضاد جذبات کو ابھارا ہے۔ ان خطوں میں صبح کی بیداری اور شام کے سلونے پن کے ساتھ سرشاری ہے۔ یہاں زندگی بہت سی منزلوں سے گزرتی معلوم ہوتی ہے۔

"قرۃ العینی۔ تمھارا خط جو مدّت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگالیا اور دیر تک باربار پڑھتا رہا افسوس کہ دیر تک ملنے کی امید نہیں۔ بمبئی یا جزیرہ دو قدم پر تھے۔ زہرا صاحب نے تھوڑی ردوکد کے بعد منظور کرلیا کہ پھر کبھی لکھنؤ آئیں لیکن تم اتنی غریب نوازی کیوں کرو گی۔"

"لیکن یہ کیوں کہ ممکن ہے میں عرش تک پہنچ نہیں سکتا۔ اور تم عرش سے اتر نہیں سکتیں تاہم ناامیدی نہیں۔"

شبلی بدمذاق مولوی نہ تھے اور نہ مقتل کی سی سنجیدگی کے قائل تھے عطیہ کو ایک شعر کا مطلب سمجھاتے ہیں:

چشمش ببوئے مانگہ ناتمام کرد
ساقی بجام ریخت مے نارسیدہ را

"اس کی آنکھوں نے میری طرف دیکھا لیکن خوب آنکھ بھر کر نہیں دیکھا۔"

جزیرہ کا یہ خواب انھیں ہمیشہ بیداری میں نظر آتا ہے۔ اگر وہ دوستوں سے بے تکلفی کی حد تک بے باک تھے تو عورتوں کے سلسلے میں رندانہ مذاق اور جرأت رندانہ دونوں کے قائل تھے ان کی انشا میں نفاست جیتی اور گہرا رنگ ہے تصور میں انھوں نے قرۃ العین اور نورجہاں جیسی عورتوں سے محبّت کی تھی۔

اور زندگی میں نہ جانے کتنے جلوہ ہائے رہگزر نے انھیں بیتاب کیا ہوگا ان کی زبان میں ایسی سرمستی، رچاؤ اور زیر و بم ہے کہ الفاظ سانس کی خوشبو سے مہکتے اور گرمی سے پگھلے معلوم ہوتے ہیں اور ایسی فضا میں پہنچاتے ہیں جہاں شفاف موجیں الفاظ سے بوس و کنار میں مصروف نظر آتی ہیں:

رگ سنگم شرارے فی نویسم
کف خاکم غبارے می نویسم

بیگم بھوپال کی سواری اور شاندار جلوس سے ان کے دل و دماغ اور بدن میں پھریری آجاتی ہے۔ عطیہ کو خط میں آزادی نسواں کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن عورتوں کی انفرادیت۔ شرافت نفس اور آزادی عمل کے قطعاً خلاف ہیں عورت کو وہ اشیائے خوردنی یا زیادہ سے زیادہ عید کی سویاں سمجھتے ہیں اور جب پر قدغن رکھنا آدمی کا فرض منصبی اور قمطراز ہیں۔

"عورتوں کے متعلق تمھاری رائے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں لیکن یاد رکھو کہ مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کیے اس بل پر کیے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان۔ چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہیے۔ جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی۔ دلیری، دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے"

یہ تجربہ لاکھ درست سہی۔ لیکن شبلی کے منھ سے یہ عجیب سا لگتا ہے اور

چونکا دیتا ہے — کہیں آزادی خیالات کا یہ وعظ اس لیے تو نہیں کہ ان کی ترقی پسندی پر آنچ نہ آجائے۔ کہیں ان کو قدامت پسندوں کی صف میں رکھ لیا جائے اور ان کو پرانی قسم کا ہونق مولوی نہ سمجھ لیا جائے۔ اسی لیے وہ ذہنی روشنی اور جذبہ کی گرمی کا فریب دے کر صاف نکل جاتے ہیں۔ جمالیاتی تناسب کا یہ تصور خالص یونانی ہے جو شبلی کے مزاج سے میل کھاتا ہے اور بہت سے خیالات کی طرح عورتوں سے متعلق خیالات میں بھی تضاد ہے اس کے باوجود عطیہ کے خطوط میں قہقہے ہیں چمن کی سی رنگینی ہے خون کی سی گرمی اور سرخی ہے۔ حسن زندگی اور توانائی کے آثار ہیں۔ یہاں حسن الفاظ کو گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"نہ وہ فرض منصبی اور شاعری فرض طبعی کس کو چھوڑوں پھر اسی پر موقوف نہیں یک دل و صد ہزار سودا اخیر گزر جاتی ہے۔"

نشہ آور تھی نگاہ مست ساقی اس قدر
خود بخود لبریز ہے ہر ساغر و پیمانہ تھا
اب وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطف سخن
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

کمیٹی سے خارج رکھا گیا ہوں رسالہ میں مجھ کو دخل نہیں تو کیا مجھ سے دعاگوئی اور طبل نوازی کا کام لینا مقصود ہے مجھ کو یہ پسند نہیں کہ ایک مذہبی مجلس میں شریک ہو کر جوڑ توڑ کروں اپنا اثر بڑھاؤں اور مخالف کو شکست دوں اس جنت سے دوزخ بھلی اس مردی سے نامردی بہتر۔"

عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں اپنی سرکار پرستی کا دعوا کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"گورنمنٹ مجھ سے بدظن ہے خصوصاً معاملۂ کانپور کے متعلق میری نظموں سے۔ تم ان کے نام ایک مفصل چٹھی اس مضمون کی میری طرف سے لکھ دو کہ میں مدت العمر کبھی انگریزی گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے۔ ۱۹۰۸ء میں میں نے ایک مستقل مضمون کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً فرض ہے۔"

یہ ہوئی شبلی کی سرکارپرستی اور ابن الوقتی کی مثال اور وہ ہے اسلامی مساوات کا جھوٹا دعویٰ جس پر دل کی حرارت۔ دماغ کی جودت اور قلم کی روشنی صرف کی جاتی ہے اس کے باوجود رذیل اور شریف میں فرق کیا جاتا ہے۔ دسترخوان اور تعلیمی اداروں دونوں جگہوں پر ان کی شمولیت کی مخالفت کی جاتی ہے۔

شبلی کے خطوط میں قومی شعور کے دھاروں کے ساتھ گہرے ادبی سائے ہیں۔ ادبی دلچسپیاں ہیں۔ زندگی ظرافت اور ظرف ہے۔ دوستوں سے دل لگی اور چھیڑ چھاڑ کے ساتھ بزرگوں کا ادب و احترام ہے۔ مذہبی کاروبار ہے۔ کتابوں پر سیر حاصل تبصرے ہیں۔ کشمیر کی فضائیں اور بمبئی کی رنگینیاں ہیں۔ جذبات کی برانگیختگی ہے۔ عورتوں کا حسن موسیقی اور مصوری ہے۔

یہ وہ شبلی ہیں جنھوں نے قرآن و حدیث کا درس اپنے زمانے کے بہترین فاضلوں سے لیا تھا جو علم کی پیاس میں لاہور کی گلیوں میں خاک چھانتے پھرے

تھے۔ انھوں نے ہی الفاروق لکھنے کے لیے قسطنطنیہ میں قہوہ پی پی کر وقت گزارا تھا۔ جو امام غزالی کے رفیق۔ ابن رشد کے محرم راز ہیں اور سیرت النبی کے محترم مصنف ہیں جو دور خلافت عباسیہ پر اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن جب انسان جاگتا ہے تو عطیہ کو خط لکھتا ہے۔ ارباب نجد کے وحشیانہ رقص میں شریک ہوتا ہے جہاں عمامے رقصاں و پیچاں نظر آتے ہیں اور جبہ و دستار کے نیچے ریاکاری کی چشمکیں ہیں اور لب خون کبوتر کے ذائقے سے آشنا۔ جس جگہ مستی کا گرد و غبار اور سرمستی کا شور شغف ہے۔ جہاں حال و قال لیے مذہبی محفل رقص ہے۔ جس میں ایسا لہو ولعب ہے جس کی تمنا میں مے خانے لہو روتے ہیں اور پیمانے سر ٹپکتے ہیں۔

"کشمیر کا دیکھنا کچھ کم نعمت نہیں، یہاں نہ دیکھا تو قیامت میں ... جنت میں اس کا نمونہ دیکھنے میں آئے گا۔ مگر اصل و نقل میں فرق ہے۔ البتہ چمنستان لبنیٰ کو چھوڑنا۔ فردوس کو چھوڑنا ہے جو ایک زاہد سے ممکن نہیں"

طنز اور لطیف اشاروں کے نمونے دیکھئے۔

"جب عقائد کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا ان میں کرامات اولیاء حق بھی ہیں حالانکہ میں تو کرامات الشیاطین حق کا بھی قائل نہوں۔"

"میں لکھنؤ میں آکر کوٹھے پر چڑھوں تو حضرت ادریس کی طرح پھر کبھی اترنا نصیب نہ ہوگا کوئی مکان ملتا تو فوراً آجاتا۔"

مسلمانوں کی نشاط الثانیہ کے اس نقیب کے قلم میں جھرنوں کا زور اور آبشاروں کا شور ہے اور تحریر میں سلیقہ مند خاتون کا سا سگھڑ پن اور حسن جس پر سر دھنتے ہی بنتا ہے ان کے قلم کی زد میں خزاں بھی آکر بہار بن جاتی

ہے۔ رنگینیٔ مزاج اور وسیع مطالعہ نے اسلوب کو خوش رنگ اور بامعنی بنا دیا ہے۔ خطوط میں جا بجا پندار اور چشمکیں ہیں۔ لطیف اشارے ہیں۔ رجائیت اور توانائی ہے۔ کہیں چلمن اٹھتی ہے کہیں پردہ گرتا ہے۔ کہیں جرأت رندانہ کا مظاہرہ ہے اور کہیں قوت عمل کی نمود تضاد ہے تو ایسا کہ دس سال پہلے ایک عورت کی تقریر سننا قطعی ممنوع اور پھر دس برس بعد اسی خاتون کی زیارت کے لیے ریش مبارک پر عطر ملا جاتا ہے۔ اور جواز میں ایک کلیّے کو پیش کر کے صاف بچ جاتے ہیں کہ حدیث مظہر ہے تین چیزیں تم بھی پسند کرو۔ نماز۔ خوشبو اور عورت وہ حسن خیال اور حسن عمل دونوں کے قائل ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کی زندگی توازن کی تلاش میں تلف ہو گئی۔

ان کے شعور میں تیزی ہے۔ یہ ازلی حسن پرست ہیں۔ یہ خوش مذاقی اور حسن پرستی ان کے خطوط میں نمایاں ہے۔ حسن چاہے انشا پرداز کی عبارت میں ہو۔ یا قدرتی نظاروں میں نظر آئے۔ حکیم کے مشاہدات میں ہو یا عورت میں دکھائی دے۔ زندگی کے دھاروں میں ہو یا شخصیتوں میں ہو یا تاریخ کے ادوار میں ہو یہ اس کے شیدائی ہیں۔ خطوں میں ان کی شخصیت بڑی ہی بھرپور۔ بیدار اور رنگا رنگ ہے۔ ادب میں بورژوائی مذاق رکھنے کے باوجود وہ اس قابل ہیں کہ ہم ان کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ ان کے خطوط ہمارا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔

ترقی پسند شعراء کی صف میں مجازؔ کے درجہ کا تعین

افراد روزپیدا ہوتے ہیں اور سیکڑوں روز ہی مرتے ہیں۔ موت سے بھلا کس کو رستگاری ہے۔ موت سے وہ ڈرے جسے خود نہ مرنا ہو۔ لیکن کچھ لوگوں کی موت ایک بڑا المناک سانحہ بن جاتی ہے۔ مجاز کی موت ان حادثات میں سے ایک ناقابل فراموش المیہ ہے۔ ایسا جانکاہ سانحہ جو اچھے اچھوں کے یقین کو متزلزل کر دیتا ہے۔ مجاز نے اس فریب آگیں دنیا سے ۳؍دسمبر ۱۹۵۵ء کو منہ موڑ لیا۔ آج ہم اس کی ۲۲ ویں سالگرہ مناتے وقت اسے کیا نذر کریں۔

چلئے چند سطور ہی سہی ؎

آؤ مل کر انقلاب تازہ پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مجازؔ کی قدر و قیمت کا احساس اس کی موت کے بعد بھی کو ہوا ہے۔ میں مجاز

کے درجے کا تعین کرنے چلا ہوں۔ ترقی پسند تحریک نے اردو کی نئی نسل کو یا عصر نو کو جو شعراء عطا کئے ہیں۔ ان میں مجاز کا مقام سرِ فہرست ہے۔

شاعرِ شہرِ نگاراں، مطربِ بزمِ دلبراں اور شہیدِ عشرتِ دوستاں یعنی مجاز کے ملنے والوں میں جو باقی ہیں ان کا کہنا ہے کہ مجاز کے ٹوٹ کر ملنے کا ڈھنگ۔ خلوص۔ خود داری مزاج کی خوش طبعی، نازک اور لطیف احساسات کا بانکپن اس کی شخصیت کی مقناطیسی کشش ایسی تھی کہ جو اک بار ملا گرویدہ ہو گیا۔ حیف صد حیف مجاز کی زندگی سے بھرپور مسکراہٹیں ہمارے دلوں کو صرف ۴۴ سال گرما سکیں۔ اجل کے تند جھکڑ نے اس ضیا بار شمع کو آخر ش ۴۴ سال کی عمر میں بجھا کر ہی چھوڑا۔ خوش فکر شاعر، معصوم و مغموم انسان، غموں کی یورش کو سینے سے لگائے، ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا جسم تو دب سکتا تھا دبا دیا گیا۔ اس کی مضطرب و بے قرار روح پر کسی کا ہاتھ نہیں پڑ سکتا خوب سے خوب تر کی متلاشی روح آج متقاضی ہے کہ ہم آج یہ عزم کریں کہ اسے نہ کبھی بھلائیں گے اور نہ اس کے درجے سے اسے گرائیں گے، برخلاف اس کے کہ اس کی انفرادیت میں جو کلاسکیت اور رومانیت کا امتزاج ہے اسے آگے بڑھائیں گے۔

مجاز رودلی ضلع بارہ بنکی کے ایک خوشحال زمین دار گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ بے جا لاڈ و پیار نے اس کو بچپن ہی میں خود فریبی میں مبتلا کر دیا تھا۔ بچپن نے جب غنفوانِ شباب میں قدم رکھا تو منچلی نگاہوں کی بے باکی نے کسی کو لبِ بام مانگنے کی آرزو کی۔ اگر اسی وقت مجاز کے پاؤں میں شادی کے نام پر بیڑیاں پڑ گئی ہوتیں تو شاید وہ آگ جو آگے چل کر بے طرح بھڑکی اور جس نے مجاز کو جلا کر خاکستر کر دیا اور جس کو بعد میں غلطی سے انقلاب سے تعبیر کیا گیا۔ نہ بھڑکتی۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہم ان بیش بہا

جواہر پاروں سے محروم رہ جاتے جو آج آوارہ، سرمایہ داری، طفلی کے خواب، اعتراف، نوجوان خاتون سے خطاب، نورا اور رات اور رئیل جیسی مایہ ناز اور لافانی نظموں کے روپ میں ہمارے سامنے ہیں اور جن کے خالق کی حیثیت سے مجاز دنیائے شاعری کے آسمان پر ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ جنسی بہاؤ اور اس پر روک لگانے والی بندشوں نے مجاز کی قوت تخلیق کو متحرک کیا تھا۔ اگر مجاز شعر کا سہارا نہ لیتے اور انھیں آگے تعلیم جاری رکھنے کے مواقع نہ فراہم ہوئے ہوتے تو شاید وہ بہت ہی گھٹیا درجہ کے اوباش، لاابالی اور بدکردار آدمی ہوتے۔ شاعر نے جذبات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر اپنے کو مکروہات دنیا سے بچا لیا، علوم و فنون اور ادبی صحبت اور اپنے خلاقانہ ذہن کی بدولت وہ قعر مذلت میں گرتے گرتے بچ گئے۔ وہ ادبی دائرے میں رہ کر حریم ناز کا دروازہ کھٹکھٹانے ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ بوکھلائے یہ اس وقت جب افسر اور شاعر کا موازنہ ہوا۔ زر نے شعر کو نیچا دکھایا، افسر کو ترجیح دی گئی تب مجاز نے روایت کو جذباتیت کا لبادہ اوڑھا کر اپنی اس ناکامی پیہم کو سماجی پیچ و خم کے آئینہ میں دیکھا اور اسی میں کہیں کہیں اجتماعیت بھی آگئی۔ مجاز کے شعر میں ایک جھلاہٹ ہے جو خود ان کے اوپر طنز ہے۔ مجاز نے اگر ہوش کے ناخن لیے ہوتے تو شاید ذرا چونک کر نئے انداز سے سوچتے اور ان کی وہ حسرت پوری ہو جاتی جو تا دم آخر حسرت ہی رہی مجاز نے اپنے لب و لہجہ اور واہ واہ کے ہنگامے سے فریب کھایا۔ مجاز کے اشعار پردہ ہیں ان کے رستے ہوئے زخموں کا، وہ جنسی بیمار ہے اس کی دوا تھی لڑکی جو اسے آخر تک نہ ملی۔ اس نے فرار اور گریز کو اساس بنا کر عمداً خود فراموشی گوارہ کی یہ جرم قابل معافی نہیں ہے احتشام

تحریک کو دل و دماغ میں رچا بچا لینے کے بعد بھی مجاز اپنے گرد و پیش سے چشم پوشی برتا کیے۔

ہر تہذیب اپنے اسالیب خود دریافت کرتی ہے اپنے روح کے اظہار کے لئے ہوش سنبھالتے ہی مجاز نے سرمایہ داری کا دیو استبداد دیکھا، حکومت کے پردے میں لوٹ مار اور غارت گری اور تہذیب کے پردے میں بہیمیت اور درندگی پھیلا کر سرمایہ دارانہ نظام نے زندگی کو موت سے ہم کنار کر دیا تھا۔ زندگی کی اعلیٰ و ارفع اقدار پامال کر دی گئی تھیں، لکھنوی تہذیب کا مزاج نشاط پرستی ہے، اس وقت بھی تھا، روایت گلے سے چمٹی ہوئی تھی، رنگینی اور تصنع کی حد تک سجاد ظہیر نے اس میں جو رنگ بھرا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ داخلیت پر خارجیت غالب آگئی، یہ رنگ اردو کے لئے نیا تھا۔ گھٹیا اور تھرڈ ریٹ احساس و فکر نے گھٹیا اور رقیبانہ شاعری کو جنم دیا نثر میں بھی اس نے یہی گل کھلائے، اردو شعر و ادب میں جب مجاز نے نغموں کی لطافت کا جادو جگایا تب قدیم اور جدید صحت مند اقدار ہم آہنگ ہو کر گلے مل رہی تھیں معاشرہ میں سیاسی اور سماجی شعور بیدار ہو چکا تھا۔ یعنی مجاز کا دور وہ دور ہے جب لکھنؤ نے ایک بار پھر سنبھالا لیا تھا۔ ادبی حیثیت سے اس وقت لکھنؤ کی آغوش میں ڈاکٹر عبد العلیم، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، ڈاکٹر محمد حسن، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر رشید جہاں، قرۃ العین حیدر، سردار جعفری، سبط حسن وغیرہ وغیرہ ایسے تخلیق کار آن بیٹھے تھے۔ جب مجاز لکھنؤ آئے تو ان ادبی ستونوں سے ٹکرائے۔ مجاز نے اپنے کو اس ماحول میں بڑی چابک دستی کے ساتھ ایڈجسٹ کر لیا۔ مجاز کے حساس ذہن پر اس حقیقت نے دور رس اثرات چھوڑے،

جوان کی شاعری میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ فانی اور جذبی کا اثر مجاز نے بہت بعد میں قبول کیا ہے۔ عصری تقاضوں سے بچ کر بھلا کون نکل پاتا ہے۔ مجاز کے وجدان پر اس حلقہ نے اک مثبت تاثر مرتب کیا جو فرسودہ روایت سے بغاوت پر آمادہ تھا۔ زاریت کے خاتمہ کے بعد جو سویرا نمودار ہوا اس سے سب کی نظریں خیرہ ہو گئیں فلسفہ اور اشتراک کا تصور لے کر یہ حلقہ حقیقت نگاری کے میدان میں کود پڑا۔ ترقی پسند تحریک جب اضطراری جذبہ کا شکار ہوئی تو اردو شاعری کو کچھ کام کی باتیں ملیں۔ اردو شاعری کو اس نے جب سستی نعرہ بازی میں تبدیل کرنا چاہا تو مجاز نے ایسے آڑے وقت میں فن کی بنیادی قدروں کا احترام کیا ادب اور زندگی کے رشتے کو استوار کیا ملک کے تہذیبی ورثہ کو آگے بڑھایا ترقی پسندی اور جدید اندازِ فکر و نظر کے باوجود مجاز نے قدیم روایات اور ادبی اقدار کو پامال ہونے سے بچایا ہے۔ مجاز کی ادبی صلاحیتیں ہمیشہ اس کی خودداریوں کے تابع ہیں۔ مجاز کو انقلابی یا سیاسی شاعر کہنا مجاز کے ساتھ زیادتی کرنا ہے۔ جو اثر مجاز نے جذباتی طور پر قبول کیا تھا وہ بھلا انقلاب کیسے ہو سکتا ہے۔ مجاز کی شاعری شباب و مستی کی شاعری ہے جس میں رومانس (انگریزی کے کٹس سے تشبیہ دی جا سکتی ہے) کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے۔ مجاز ایسا جذباتی اور حساس نوجوان جب معاملات شوق میں ناکام ہوا تب اسنے جذباتی انداز میں جو راگ الاپے ان سے فطری طور پر باغیانہ بو تو آنی ہی چاہئے تھی غلطی سے نوجوان طبقہ اس غنائیہ کو انقلاب سمجھ بیٹھا۔ مجاز کے احساسات فنی حیثیت سے مکمل ہیں۔ مجاز کی شاعری سرتاسر سوز و ساز، درد دل اور سوز دروں کی شاعری ہے۔ زندگی کے ساتھ ادبی طریقہ سے حسن و عشق کو ہم آہنگ کر کے مجاز ایسے غواص نے جو موتی خونِ جگر صرف کر کے

ادبی و شعری سمندر سے نکالے ہیں وہ سچے ہیں۔ مجاز کی جمالیاتی شاعری دل کے تاروں کو مرتعش کر دیتی ہے۔ مجاز وجدانی شاعر ہے جو محسوس کرتا ہے وہی لکھتا ہے وہ پرانے جذبات کو نئے انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ مجاز نے اتنی کم عمری میں جو لکھا ہے وہ صفحۂ قرطاس پر ٹھہر جاتا ہے، اس میں عمق بھی ہے، گیرائی اور گہرائی بھی۔ سوز و ساز بھی ہے دل کی دھڑکنیں بھی ہیں۔ رقص مستانہ کا لطف نظارہ بھی اور وہ نیش غم ہے جس کا معاملہ تلخیٔ کام و دہن سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ مجاز نے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی زندگی معاشی اعتبار سے بڑی دکھ بھری کہانی ہے یہاں لذتیت بھی ہے اور ذوقِ پنہاں کی کامرانی بھی اس کی بات دل کو چھو لیتی ہے۔ مجاز بڑا فنکار تھا۔ تقسیم وطن کے بعد وہ شیرازہ بکھرا جس کے سہارے مجاز اپنے کو سنبھالے ہوئے تھے۔ یہ حلقۂ شامِ غریباں میں آرزو اور تمنا کے سہارے صبحِ نو کا منظر تھا وہ صبح تو آج تک نہ آئی، مجاز بھی نہ رہا، جب الجھنیں اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گئیں، آمدنی صفر ہو گئی تو تنہائی اور پیسے کی کمی کے احساس نے مجاز کو مجبور کیا کہ وہ اپنی زندگی اور اس کی ساری تلخیوں کو وقف مے رنگیں کر دے۔ یہ اس نے کیا۔ لیکن کبھی سوقیت کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیا۔ ترقی پسندی اپنی بڑھی ہوئی بے راہ رویوں کی نظر ہو گئی لیکن مجاز کا کلام اس زد سے یعنی ابتذال سے پاک و صاف ہے۔ جو مجاز کی اپنی شناخت ہے۔

حقیقت نگاری کی آڑ لے کر نام نہاد، ترقی پسندی کے مسلک کی تائید کرنے والوں کی زد سے مجاز نے اپنے کو بڑی حد تک بچایا ہے اور اسی لیے ان کے یہاں سچے ادبی جواہر ہیں جو لافانی ادب کی جان ہیں۔ مجاز آوارہ، ناشاد و ناکارہ بنا۔ مے و مستی میں خود کو ڈبو کر ایک کرب میں مبتلا ہوا لیکن اپنے کلام کو اس وحشت و آوارگی سے

اس نے ہمیشہ محفوظ رکھا اور اپنے درجے کا تعین خود کر لیا مجاز کی ترقی پسندی میں دل گداختگی اور ابروئے شیوہ اہل نظر برقرار ہے۔ مجاز کی شاعری سادگی، حسن، اعجاز، فن اصلیت، اور تغزل کے لئے ہمیشہ زندہ رہے گی۔ حسن و عشق مجاز کی ذات تھی۔ اس کے رازہائے سربستہ کو مجاز نے شیریں، دلکش اور رعنائیہ لے میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ذاتی حسن میں اجتماعیت کا رنگ جھلک اٹھا ہے یہ اور بات ہے کہ مجاز کی پوری زندگی ایک خوش آئند مستقبل کا سنہرا خواب دیکھنے اور معاشی طور پر بہتر زندگی گزارنے کی حسرت اور توقع کی نظر ہو گئی اور وہ آخر تک شاعر کی حیثیت زمانہ سے نہ منوا سکا لیکن زندگی کی ناکامیوں، نامرادیوں اور پیہم شکستوں اور معاشی طور پر دیوالیہ پن نے مجاز کی فطری خوش طبعی، ذہانت اور فنی طور پر اس کے میٹر اور فارم پر کم ہی اثر ڈالا ہے یا بالکل نہیں ڈالا ہے۔ وہ خود سماج اور اس کے گھناؤنے ماحول کا شکار ہو گیا اس معاشرہ نے اور پورے نظام نے اسے پیس ڈالا اور اس کے باوجود اس نظام کے خلاف وہ تلخی نہیں ہے جس سے اس کی شاعرانہ لطافت اور شاعرانہ عظمت پر بٹہ لگایا جا سکے۔ اس کے ذاتی احساسات میں اجتماعیت کا رنگ ہے کلام میں وہ گرمی، ہے جسے خونِ جگر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے زمانے کے ہاتھوں آزادی کے دوران بڑی، سج دھج سے ابھرنے والا یہ پرخلوص شاعر سطحی شخصیت کا مالک بن گیا۔ اس میں نئے سماج کی تعمیر کا جذبہ تھا وہ پوری طرح احساس رکھتا تھا۔ طبقہ دارانہ بدعہدیوں کا، ناانصافیوں کا اور مظالم و جبر کا وہ کرم خوردہ نظام کو بدل دینا چاہتا تھا۔ وہ شاعر کی سماجی حیثیت منوانا چاہتا تھا لیکن نہ نظام کو بدل سکا اور نہ شاعر کی سماجی حیثیت ہی منوا سکا۔ خونِ جگر صرف کرنے والے شاعر کی جھولی میں زمانے نے صرف

واہ واہ کے چند ٹکڑے ہی ڈالے اور اس واہ واہ کے ہنگامے میں لپیٹ کر بے شمار تلخیاں لاانتہا بے مہریاں چند کھوکھلے قہقہے اور کچھ روکھے ستائشی کلمات ٹھہر دیئے۔ مجاز اس المناکی اور بے اعتنائی کے باوجود قنوطیت کا شکار کبھی نہ ہوا وہ سماج کو سدا قابل رحم سمجھتا رہا۔ مجاز اپنی عظمت، جاذب شخصیت اور شعری و ادبی دنیا میں اپنے واضح مقام سے قطعی لاپرواہ تھا۔ اس نے تو اپنی رومانی طبیعت کے چنچل تقاضوں سے مجبور ہو کر زندگی کے بڑے حسین خواب دیکھے تھے۔ اس خواب کی تعبیر کی حسرت میں وہ خود جل بجھا اس نے آگ کو گلستان بنانا چاہا لیکن وہ آگ کو گلستاں نہ بنا سکا خود ہی خلیل کی طرح اس آگ میں جل بجھا۔

مجاز کے کلام میں نہ خطیب کے نطق کی کڑک ہے نہ باغی کے دل کی آگ نغمہ سنج گلے کا وفور ہے وہ موضوع اور ہیئت میں فن کی ساری بلندیاں سمو کر جذبات اور احساسات کے سارے تاروں کو جھنجھنا دیتا ہے۔ اس کی شاعری میں انفرادی لہجہ کے ساتھ اجتماعیت ہے قنوطیت اور حضریت کا دور دور تک پتہ نہیں مجاز نے فن کے متناسب نظریہ کو بڑی خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ مجاز کو ترقی پسندی کے نظریۂ فن کا واضح علم اور صحیح ادراک تھا۔ مجاز کی خوبی یہ ہے کہ اس نے ہنگامی موضوعات سے ہمیشہ گریز کیا اس نے اپنی خود کردہ بے راہ رویوں اور اعتدال سے بڑھی ہوئی مے نوشی کے باوجود اردو شاعری کو اتنا دیا ہے جتنا کوئی بھی ترقی پسند شاعر نہیں دے سکا اور اسی لئے اس کا مقام ترقی پسند تحریک کی صف میں دائیں یا بائیں نہیں درمیان میں ہے اور سر فہرست ہے۔ اگر وہ زندہ رہتا تو یقیناً اردو شاعری کو بہت سے بیش بہا جواہر پارے اور مل جاتے لیکن وہ بہت

کم عمری میں ہم سے جدا ہو گیا۔ اس کی آواز کو اسی لے کے ساتھ آگے بڑھایا جائے تو یہ اردو شاعری کے لئے ایک نیک فال ہو گا۔ اس کی موت ہمارے ناخوشگوار سماجی حالات پر ایک بھرپور طنز ہے۔

منٹو۔ فن اور شخصیت

اگر افسانوی ادب کا نقطۂ عروج پریم چند کے افسانوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ تو ان کے بعد جس نسل نے فن افسانہ نویسی کو اردو ادب میں بلند مقام دلوایا ہے۔ ان میں سے کچھ جاندار نام کرشن، قاسمی، بیدی قرۃ اور عصمت کے ہیں اور ان میں سب سے ممتاز اور منفرد نام ہے منٹو کا جس نے اردو افسانے کو ترقی دے کر فنی طور پر انھیں لائق بنا دیا کہ وہ عالمی ادب سے آنکھ ملا سکے، منٹو کی کہانیوں کے سارے کردار اپنی تمام انسانی کجیوں اور کمزوریوں کے باوجود آج کے انسان کے آدرش کردار ہیں۔

کرشن اردو افسانے کے مکان میں رومانیت کے پچھلے دروازے سے داخل ہوئے اس لئے کہ یہی ان کے لئے محفوظ و مامون تھا۔ کمرشیل نقطۂ نظر سے وہ اردو کے نام کو یہیں سے عافیت کے ساتھ کیش کر سکتے تھے اور یہی انھوں نے کمال

چالاکی کے ساتھ کیا بھی۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں وہ ادب کی ایک سے زیادہ اصناف پر قدرت رکھتے ہیں۔ افسانے پر بھی ان کی انمٹ چھاپ ہے اسے فن سے روشناس کرا کے حقیقت اور زندگی کے چہرے سے بہت پردے انھوں نے اٹھائے ہیں اور افسانے کو ہمہ گیریت بخشی ہے۔ زندگی کی بھرپور عکاسی کرکے کچھ ایسے تجربات افسانے میں سموئے ہیں جو اس وقت تک چشم خلق سے پوشیدہ تھے

بیدی کے پاس بصیرت ہے وہ زندگی کی کڑی دھوپ میں تپے ہیں اور اس کی حدت کو محسوس کر کے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں پیش کرنے کا ملکہ بھی رکھتے ہیں ایسے کہ ان کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کو زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے ان کے قلم کا کمال یہ ہے کہ ان کے پیش کردہ خاکوں میں زندگی کی تڑپ ہے فنکارانہ اعتماد ہے وہ رنگ جمانے والے یعنی صورت حال کے مطابق فضا بنانے والے HARMONIC الفاظ سے بڑے کام لیتی ہیں ان کی کہانی میں کئی زماں ایک ساتھ چلتے ہیں وہ رومانی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعرانہ زبان سے نثر کی طرف پلٹی ہیں ان کی کہانی ایسی پینٹنگ ہے جس میں تکنیک اور ہیئت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا ہے۔

عصمت نے متوسط طبقے کی معاشرتی زندگی کو بے باک طنز کا نشانہ بنا کر بہت سی پتے کی باتیں کہی ہیں جنس اور تحلیل نفسی ان کے مرغوب موضوعات ہیں۔ اور منٹو ....

اس نے رموزِ زندگی کا مطالعہ بہت جم کر کیا تھا۔ اس کی بصیرت ذہانت اور مشاہدہ غضب کا ہے۔ حقیقت کی تلاش میں اس نے خود کو گھٹنوں گھٹنوں گندگی اور غلاظت میں دھنسایا ہے اور تہہ سے جو کچھ حاصل کیا ہے اسے صاف کر کے اس طرح بیان کیا ہے کہ حق ادا ہو گیا ہے اس کی روح اس آلودگی سے ہمیشہ پاک رہی جس کے لئے اس کے سارے افسانے دال ہیں زندگی کو اس نے خوب خوب جھیلا اور برتا تھا اس کے باوجود لطیف احساسات سے بھرا اس کا نرم دل بہت ہی گداز اور حساس تھا اگر نہ ہوتا تو وہ اپنے معصوم بچے کی موت پر یوں پھوٹ پھوٹ کر نہ رویا ہوتا اور سماج میں انسان کی تذلیل سے اس درجہ دل گرفتہ نہ ہوتا وہ اندر سے اتنا ہی زخمی تھا جتنا ایک دردمند انسان۔

منٹو سے مجھے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا لیکن میں اس سے نہ مل سکا اس کی تصویر بہت غور سے دیکھی ہے اس کے افسانے بڑے چاؤ سے عرق ریزی کے ساتھ پڑھے ہیں، اس پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سے بہت کچھ کا بہ نظرِ غایر مطالعہ بھی کیا ہے اور اس کے بعد اس کی جو شکل بنی ہے وہ کچھ یوں ذہن میں آئی ہے۔ پہلے ایک لڑکھڑاتا ہوا ڈھانچہ ابھرتا ہے اور پھر خد و خال نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

اٹھتا ہوا قد۔ لمبی لمبی انگلیاں۔ اور ان پر ابھرے ہوئے بال موٹے موٹے عینک کے شیشوں کے پیچھے سے لپکتی ہوئی بڑی بڑی اداس آنکھیں سیاہ پتلیوں والی۔ اس کی آنکھیں دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں ان میں جھانکیے تو ایسا محسوس ہو گا جیسے کہ یہ شخص موت کے اندر تک دیکھ آیا تھا۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ عصمت نے یہ کیوں کہا تھا کہ اس سے مل کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے ذہنی قوتوں

پر دھار رکھی جا رہی ہے۔ نازک نازک ہاتھ خوبصورت سڈول پیر بڑے سے سر پر ڈھیر سارے بال کشادہ اور فراخ پیشانی، بے تکے دانت اور باریک لب علم الاعداد کے حساب سے بھی ایسا آدمی بلا کا ذہین ٹھہرتا ہے اور وہ ذہین تھا بھی۔

اسے خودستائی کی عادت تھی یہ بڑھی ہوئی انا کا شکار تھا اس کے اسی بیجا زعم اور کسی کو خاطر میں نہ لانے کی فطرت نے غرور کی حدوں کو چھو لیا تھا۔ اس سے دوسروں کو اتنا نقصان نہ پہنچا جتنا خود اس کو پہنچا۔ چہرے پر رعونت، گستاخی اور بے ساختہ پن برستا تھا۔ لیکن انداز گفتگو کھلنڈرا تھا، خود بہت باتونی تھا۔ شگفتہ باتیں بھی بڑی گرم گرم اور دل چسپ کرتا تھا۔ جو اس وقت تک معلوماتی رہتی تھیں جب تک بئیت نے اپنا اثر نہ دکھاتی تھی۔ منٹو شراب بہت پیتا تھا۔ اور آخر آخر شراب اس کو پی گئی لیکن اس سلسلے میں وہ ریاکار نہ تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرنے سے کچھ دیر پہلے اگر اس نے کچھ طلب کیا تو اسی قاتل کو جس نے اس کی انانیت کا سارا بھرم کھول کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے، شراب کی کمی یا زیادتی کوئی اچھا فعل نہیں ہے اور اس کو منٹو کی خاطر کسی مجبوری کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا۔

وہ لڑائی بہت لڑتا تھا۔ لاٹھی، تلوار یا ڈنڈے سے نہیں زبانی اور ذہنی اور جب تک جیتا رہتا تھا، مارتا جاتا تھا۔ وہ (SAODIST) تھا اسے دوسرے کو ایذا پہونچانے کر لطف آتا تھا اور جب محسوس کرتا تھا کہ ہارنے لگا ہے تو فرار اختیار کر لیتا تھا، بھاگ جاتا تھا یہ اس کی کمزوری تھی

۵۔ آگے گلی راستہ نہیں ملے گا

کہا، موٹر یہیں روک لو۔ اور ادھر باجو والی گلی سے چلے جاؤ" خود ہی عاجلانہ فیصلہ کر"

اور بھاگ کھڑا ہوا۔ امرتسر سے علی گڑھ، علی گڑھ سے دلّی، دلّی سے بمبئی، اور بمبئی سے پاکستان جتا کہیں نہ تھا۔ طبیعت کی اس سمابیت نے بھی اسے کافی کنوئیں جھنکوائے۔ اسے ٹھہراؤ سے سخت الجھن ہوتی تھی اور اسی لئے وہ زندگی بھر بھکر رہا اسے زہد، حسا اور کفایت شعاری سے چڑ تھی۔ اسے شکوہ تھا کہ زمانہ اس کی قدر کیوں نہیں کرتا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ زندگی میں وقت نے کسے گھاس ڈالی ہے فنکار کی حیات تو اس کی قدر اور شہرت کے درمیان دیوار ہے یہاں تو مرنے کے بعد ہی سر پر بٹھایا جاتا ہے لیکن یہاں یہ گلہ بھی بے جا نہیں ہے کہ مرنے کے بعد منٹو کے ساتھ اس کے رتبہ کے مطابق کچھ کم ہی کام ہوا ہے جبکہ وہ اس سے کہیں زیادہ کا مستحق ہے۔

منٹو بہت نفاست پسند تھا، گھٹیا چیز اسے ہٹی بیر تھا وہ خوبصورت پیکیٹ اور اس میں اعلیٰ کوالٹی کا سگریٹ۔ صاف ستھرا گھر عمدہ کپڑے بہترین قلم اور اچھے برانڈ کی شراب اور لذیذ کھانے پر جان چھڑکتا تھا

اردو ٹائپ کرنے والا یہ انشا پرداز اپنے اوپر کوئی چبھتا ہوا فقرہ یا چبھتی ہوئی بات برداشت نہ کر سکتا تھا وہ جو دوسروں کی کھنچائی میں مشاق تھا اپنی کھنچائی پر بے طرح گھبراتا تھا۔ وہ ناقدوں سے بھی ایسی کنی کاٹتا تھا کہ وہ اس کی بندی کی چندی کرنے میں پیش پیش رہتے تھے وہ کہا کرتا تھا کہ ان بے تحاشا پڑھے لکھے لوگوں (ناقدوں نے) میرے فن کی دوشیزگی کا جھٹکا کر کے اسے تباہ کرنے کی شعوری کوششیں کی ہیں اسی سبب سے وہ نہ کبھی عبدالماجد دریا آبادی کو جھیل سکا اور نہ کبھی ایڈیٹر دنیا میں کو عزیز رکھ سکا وہ ایسا منہ پھٹ فنکار تھا جس سے ہر جماعت ہر مکتبہ خیال اور ہر طبقے کے افراد کو پناہ مانگتے تھے اس کا کاٹا پانی نہ مانگتا تھا اسلیے

کہ سماج کے اندر بھرا ہوا زہر تھا ہی ایسا قاتل اور جان لیوا بالکل تنہا لیکن خود میں ایک انجمن اور اس پر اگر وہ اپنے ہم عصروں میں سے کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا یا اپنا ہم پلہ نہ گردانتا تھا تو کیا برا کرتا تھا۔

منٹو ۴۲ سال تک اس انسان کش ماحول میں سولی پر لٹکتا رہا وہ پاکستان اس امید پر گیا تھا کہ اسے اسلامی مملکت میں وہ تمام آسانیاں اور آسائشیں میسر آجائیں گی جن کے لئے وہ ترستا تھا اور جن کی ایک جھلک اس نے دلی اور بمبئی میں دیکھی تھی۔

لیکن وہاں پہونچ کر تو اس پر ادبار اور مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے جتنا ذلیل و خوار وہ پاکستان میں ہوا شاید ہندوستان میں کبھی نہ ہوتا۔ منٹو کتنے دل گردے کا انسان تھا اور کتنا بزدل تھا۔ یہ کچھ وہیں کھلتا ہے اسے تو اپنے تحفظ کی خاطر اور اپنی جان ناتواں میں کچھ جان باقی رکھنے کے لیے کیا کیا پاپڑ نہ بیلنے پڑے تھے۔ اس پر فحاشی کے پانچ سے زائد مقدمے چلے اسے تو وہاں ناکردہ گناہوں کی سزا بھی بھوگنی پڑی تھی۔

اگر اسے معاشی طور پر آسودگی میسر آگئی ہوگی تو شاید وہ اس سے بھی اچھے افسانے تخلیق کر سکتا تھا اور ایسا بھی ممکن تھا کہ وہ کچھ نہ لکھتا اور ہم بہت سے ادبی جواہر پاروں سے محروم ہی رہ جاتے۔ قلم پر دھار اور سان اسی وقت آتی ہے جب قلم کار معاشی طور پر بدحال ہو۔ بھوکے پیٹ مسرت اہمیت نہیں رکھتی لیکن ادب خوب پروان چڑھتا ہے کچھ ہی سہی۔ منٹو چاہتا یہ تھا کہ دلی میں معقول آمدنی ہو۔ پینا پلانا ہو یا قہقہے ہوں اور بے فکریاں۔

ایک وقت تھا کہ دلی میں منٹو کا طوطی بولتا تھا اس وقت اردو ادب کے کئی ستون آل انڈیا ریڈیو کے ارد گرد مجتمع ہو گئے تھے یہاں منٹو کا فن عروج پر نظر آتا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہاں اسے اپنے فن کو آگے بڑھانے اور اس پر صیقل کرنے کی تحریک ملتی رہتی تھی۔ کچھ ایسا ماحول اور کچھ ایسی تناتنی تھی کہ ہر ایک کو خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رکھتی تھی اوپندر ناتھ اشک سے اس کی چھوٹی چھوٹی رنجشیں، گہری رقابتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں جوڑ توڑ اور دفتری سیاست افسانے کے حق میں بڑی مفید اور بہت سود مند ثابت ہوئیں۔ منٹو کی اس عرصے کی تخلیقات میں زندگی کی وہ توانائی اور تازگی ہے جس کے لیے اردو افسانہ نویسی ایک مدت سے ترستی تھی اور اس کے بعد آج پھر متقاضی ہے کہ کچھ نہیں تو کوئی
منٹو جیسا تو پیدا ہو۔

منٹو اپنے اوپر کسی چیز کو حاوی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ہے اگر منٹو کی عصمت سے شادی ہو گئی تو شاید بہت جلد علاحدگی کی نوبت آجاتی اس لئے کہ عصمت کا پلڑا کبھی کبھی بحث میں منٹو پر بھاری پڑتا تھا اسے توصفیہ جیسی چھوٹی موٹی اور سراپا سپردگی والی عورت ہی پسند آسکتی تھی اور اسی سے اس کا نباہ ہوا۔

منٹو اردو کے ان عظیم افسانہ نگاروں میں سے ایک ہے جنھوں نے اردو افسانوی ادب کا وقار اور مرتبہ بڑھایا ہے، منٹو نے بقول خود بڑے ہپ ٹلّا قسم کے افسانے لکھے ہیں اور اپنے گوناگوں تجربات عمیق مشاہدے ژرف نگاہی اور ذہانت سے افسانے کی نئی کائنات تعمیر کی ہے جس میں خیال فکر اور انداز بیان کے ساتھ

افسانویت بھی ہے جس کی بنیادیں بہت ہی مضبوط ہیں، اپنی شخصیت کو فن میں تحلیل کرے اور خون جگر سے سینچ کر جو ادبی جواہر پارے افسانوں کی شکل میں منٹو نے عطا کیے ہیں ان کو پڑھ کر دل میں ہوک سی اٹھتی ہے اور جن میں کشش اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ انداز بیان کی رنگینی اور چٹپٹا پن ابتدا سے انتہا تک قائم رکھنا اور فن و ٹکنک کو کہیں بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا منٹو ہی کا کمال ہے اس کی پیش کردہ تصویر کا کینوس بہت وسعت لیے ہوئے ہوئے ہے۔ جذبات کے اظہار اور بیان میں جو گہرائی، گیرائی اور عمق ہے اس سے بہت سے محروم ہیں، تخیل جذبے اور تفکر کی آنچ دے کر جو ادبی سونا ہمارے سامنے ہے وہ ادبی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے اور فن و ٹکنک کا نمائندہ بھی ہے اسے کہانی کہنے کا گر آتا ہے یعنی اس نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے جو کچھ دیکھا ہے اسے فنی احساس اور ذہانت کے ساتھ اس طرح لکھا ہے کہ وہ صفحۂ قرطاس پر ٹھہر جاتا ہے اس نے لکھنے سے پہلے سوچا ہے لکھتے وقت فکر کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رکھا ہے اور لکھنے کے بعد تفکر کی مقراض سے اسے کانٹ چھانٹ کر پیش کیا ہے اسی لیے وہ اپنے افسانے وغیرہ کا کوئی لفظ کوئی لائن قلم زد ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا وہ جوں کے توں شائع ہوتے تھے، منٹو نے وہ اہل نثر کا دھارا یا وہ گوئی کی طرف سے موڑ کر حقیقت نگاری کی طرف بہا کر افسانوی ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔

منٹو سچا فن کار ہے پڑھا لکھا اور کھرا واقعہ نگار جس نے اپنی دوربین نگاہ نفسیاتی موشگافی اور بے باکانہ حق گوئی سے چھپی سیاست گندی معاشرت اور جھوٹے مذہب پر کاری ضربیں لگائی ہیں جن میں صداقت کے ساتھ نہ ہرنا کی کا عنصر ہے منٹو اپیل کا نہیں ہتھوڑے گھونسے مکے اور تھپڑ کا قائل تھا لیکن اس سلسلے

میں الفاظ اور زبان کا بھرم کہیں نہیں کھلتا۔ بیشتر مقامات پر وہ فطری ماحول کے مطابق اور حقیقی معلوم ہوتا ہے۔

کیا اب ہمارا افسانہ رو بہ زوال ہے؟

کیا منٹو کے بعد اس کو عروج ملا ہے؟

اگر ان دونوں سوالوں کا جواب ہاں یا نہیں میں دینے کی بات نکل آئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ آج کا افسانہ رو بہ زوال ہے اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد موضوع اور فن کے لحاظ سے افسانے نے کچھ زیادہ ترقی کی منازل طے نہیں کی ہیں منٹو کے فن کو آگے بڑھا کر اس میں کچھ زیادہ توانائی پیدا کی جا سکتی ہے

افسانے کی مجموعی ساخت میں ترتیب تشکیل اور تعمیر کو بڑا دخل ہے، تمہید، اٹھان، واقعات کا اتار چڑھاؤ، پیچ و الجھاؤ، نقطۂ عروج اور انتہا اس کے لازمی عناصر ہیں۔ قاری ظاہری ہئیت پر جان چھڑکے اور اس حقیقت نے جس مجموعی تاثر کا نقش چھوڑا ہے اس کو اس کا منطقی نتیجہ سمجھ کر قبول کرلے اور بس کامیاب افسانے کی پہچان اور پرکھ بھی یہی ہے۔

منٹو نے بہت سے افسانے لکھے ہیں جن میں کچھ کے نام اس طرح ہیں۔ کھول دو، چور، رام کھلاون، بسم اللہ، موذیل۔ خدا کی قسم۔ محمد بھائی۔ حماقت، پانچواں مقدمہ، وہ لڑکی۔ محمودہ، بلونت سنگھ مجیٹھیا، بھسما بھسی کہانی۔ بھنگن ربانی بائی۔ بارش، تصویر، نعیمہ، خودکشی، ایک زاہدہ، ایک فاحشہ، انار کلی۔ کمیشن، رشیدہ، پشاور سے لاہور تک، بدتمیزی، ڈاؤٹ، افشائے راز، مائی جنتے، جان محمد، آمنہ، بس اسٹینڈ، لالٹین، پہچان، کروٹ، نفتر۔ قادر قصائی، بجلی، پہلوان، شوشو، دیوالی کے دیے، موسم کی شرارت

خوشیا، نعرہ، بڈھا کھوسٹ، اور ڈی کوسٹا وغیرہ وغیرہ، لیکن منٹو کے تمام افسانوں میں ہتک، موذیل۔ ممی، بابو، گوپی ناتھ کالی شلوار، ٹوبہ ٹوک سنگھ، ٹھنڈا گوشت اس منجمد ہار میں۔ نیا قانون، شہید ساز اور سیاہ حاشیے، جیسے اپنا نمایاں اور بلند مقام رکھتے ہیں منٹو نے ان سب میں فنی وسیلوں کو بڑی چابک دستی، خلوص اور دیانتداری کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔ منٹو کے افسانے کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ذہن کو تاثرات کی بھول بھلیاں اور انتشار میں نہیں الجھاتا۔ برخلاف اس کے وہ اپنی فنی مہارت اور فن پر بھرپور گرفت سے ایسی فضا بناتا ہے کہ افسانے کا مجموعی تاثر فطری طور پر ذہن میں واضح طور پر آجاتا ہے افسانے کا مجموعی تاثر فطری طور پر ذہن میں واضح طور پر آجاتا ہے۔ افسانے کی ابتدا اور اختتام پر منٹو نے ذہانت صرف کی ہے اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلا ہے اس سے غفلت برت کر بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنی حیات ہی میں اپنی موت کو آواز دی ہے۔ ٹیکنک اور فن سے اغماض برت کر افسانہ نگار اپنے تابوت میں خود ہی آخری کیل ٹھونکتا ہے۔ یہ سمجھنے کی بات ہے کہ افسانے کا آغاز اور انجام ہی وہ بھرپور تاثر قائم کر سکتے ہیں۔ جو اس کو زندگی بخشتے ہیں اور جو اس کا اصل الاصول ہیں۔

نمونے کے طور پر منٹو کے چند افسانوں کی تمہیدوں سے آگاہی حاصل کیجئے تو محسوس ہوگا کہ منٹو کتنا ذہین افسانہ نگار تھا۔ نعرے ہتک، پہچان اور سویرے جو کل آنکھ میری کھلی یہ چار افسانے ہیں ان تمہیدوں سے آپ اندازہ لگائیے اور کچھ ان ہی پر منحصر نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے ہر افسانے کی ابتدا اس طرح کرتا ہے، یہ ہے افسانہ نعرہ جس کی تمہید کی دو لائنوں سے

وہ سارا پس منظر سامنے آجاتا ہے کہ آدمی اخیر تک افسانے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتویں منزل اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔"

اور یہ پہچان کی ابتدائیہ چند سطور جن سے قاری کا تجسس بڑھتا ہے۔

"ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں وہسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو ہوٹل سے پیدا کردہ تکدر کو دور کر سکے۔"

ہتک کی تمہید سے اندازہ لگائیے کہ یہ فنی چابکدستی اور کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ مطلب نکالنا منٹو کا ہی کمال ہے۔

"دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی، میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشہ میں چور گھر کو واپس گیا تھا، وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا، مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا، وہ اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

اور اس تمہید میں منٹو نے طنز کا ایک ایسا بھرپور وار کیا ہے جس کی مثال عالمی ادب ہی میں مل سکتی ہے یہ ہے سویرے جو کل آنکھ میری کھلی کی ابتدائیہ شروعات۔

"صبح کا وقت تھا، عجیب بہار تھی، عجیب سیر تھی، قریب قریب ساری دکانیں

بند ہو چکی تھیں ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ دوکان کی طرف بڑھا، تو کیا دیکھتا ہوں، بجلی کا پنکھا چل رہا ہے لیکن اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ میں نے حلوائی سے کہا یہ الٹے رخ کا پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا دیکھتے نہیں ہو، میں نے دیکھا پنکھے کا رخ قائد اعظم محمد علی جناح کی تصویر کی طرف تھا۔"

دیکھا آپ نے منٹو قاری کے دل و دماغ پر ابتدا ہی سے پوری طرح تسلط جما کر تمام درمیانی سرحدوں یعنی کردار تعارف خاص فضا یا ماحول ذہنی کش مکش اور جذبات کی عکاسی وغیرہ سے گزار کر واقعات کا تسلسل جوڑتا ہے کہ یہ سب ایک زنجیر میں جڑے اور لڑی میں پروئے معلوم ہوتے یہ اپنے تیکھے تیور سے ایک تیر سے کئی شکار کرتا ہے اور وہ اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہے۔ اسے اپنی عظمت کے اندازے کے ساتھ فن کی بلندیوں سے بھی آگاہی ہے اس نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اپنے ہم عصروں سے جو ٹکر لی تھی وہ عام ذہن کا آدمی نہ لے سکتا تھا۔ لیکن منٹو کی بڑھی ہوئی انا نے اسے بہت دھوکے دیئے۔

آیئے اب صرف دو افسانوں کے انجام بھی دیکھتے چلیں۔ یہ ہے ہتک کی ہیروئن سوگندھی۔

"بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھا لیا۔ اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں

لٹا کر سو گئی۔

اور یہ ہے سجدے کا اختتام، جس کا انجام قطعی فطری اور منطقی معلوم ہوتا ہے۔

"وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ اس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہونچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

اے خدا میرا سجدہ مجھے واپس کر دے!"

یہ صرف ان دو افسانوں کی تمہیدوں ہی پر منحصر نہیں ہے اس کے بیشتر افسانوں کے خاتمے بالکل فطری ہیں۔ ان میں تلوار کی سی کاٹ اور نشتر کی سی تیزی ہے اور یہ فنی اعتبار سے بھی قطعی مکمل ہیں وہ جس طرح آغاز پر توجہ دیتا ہے۔ اسی طرح انجام پر بھی اپنی پوری ذہنی قوت صرف کر کے ایسا مجموعی تاثر چھوڑتا ہے جو اس کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی ذہانت اور ذہنی کاوش نے اس نے فن کو جلا بخشی ہے اور اسی فطانت اور ذہانت کے بل بوتے پر وہ افسانے کے فن پر اس وقت تک حاوی رہا جب تک بالکل ٹوٹ ہی نہ گیا۔

کچھ فرسودہ تصورات کو جان بوجھ کر اس نے ہدف ملامت بنایا ہے اور ان کاری ضربوں اور ملامتوں سے بھی اس کے فن کو زندگی اور فن کو بقا ملی ہے ایک اہم بات یہ ہے کہ افسانے کے خاتمے پرستی، تن آسانی سہل انگاری۔ غفلت اور تھکن کا احساس نام کو نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں لگتا کہ فن کار نے

فن سے کہیں بھی اغماض پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے حواس شروع سے اخیر تک جاگتے رہے ہیں۔ اس کے قویٰ کہیں بھی شل نہیں ہوئے ہیں۔ وہ ابتدا تا انتہا وسباہی تروتازہ دکھائی دیتا ہے اور یہی باعث ہے کہ اس کا قاری اس کے افسانے کو جوں کا توں قبول کر کے فن، پر اس کی شدید گرفت کا لوہا مان کر اس کی عظمت کے سامنے سرنگوں کر لیتا ہے دل چسپی کا اظہار کرتا ہے خط اٹھاتا ہے۔ اور سماج کے ناسور سے جو پھوڑا بن کر غار بن گیا ہے اور اسے لگا ہے اور ایسی ہی نفرت کرنے لگتا ہے جس کا وہ متقاضی ہے۔

نیا قانون میں جذباتی شدت اپنے عروج پر ہے، کھا واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیے کے امتزاج کی بہترین مثال ہے ہتک میں جذباتی شدت سے کام لے کر معاشرے کے گھناؤنے اور قابل نفرت پھوڑوں کی نشتر زنی کی گئی ہے یہ عمل جراحی کچھ آسان نہ تھا لیکن منٹو اس میں کامیاب ہے اور آخر میں ذہن میں جو بات اپنا نقش چھوڑتی ہے وہ یہ ہے کہ بہرحال انسان، انسانی زندگی اور اس کی اعلیٰ قدریں لائق محبت ہیں معاشرے میں کچھ قابل نفرین، برائیاں حلول کر گئی ہیں جو ملامت کے لائق ہیں ان کو دور کرنے کی ضرورت کا شدت سے احساس پیدا ہوتا ہے اس کے افسانوں کا منطقی ربط ایسا ہے کہ پڑھنے والا ذہنی پراگندگی اور انتشار سے محفوظ رہتا ہے۔ منٹو بھی انسان ہی ہے۔ کہیں کہیں اس نے بھی نیچے کھائے ہیں خوشیا میں اگر اک طرف اس نے بنیادی خیال کو خوبی سے نبھایا ہے تو دوسری طرف یہ کردار غیر حقیقی اور مصنف کے دماغ کی اختراع معلوم ہوتا ہے جس کا ہماری عملی اور روزمرہ کی زندگی سے کوئی علاقہ کوئی تعلق نہیں۔

اس میں وہ فطری پن بھی نہیں ہے جو اس کے بیشتر افسانوں کی جان ہے۔ یعنی یہ کہ ایک خیال سوجھا۔ کہانی کا ڈھانچہ تیار کیا نہ لکھنا شروع کیا اور کچھ دور چل کر اپنے آپ کو دلال کے روپ میں رکھ لیا، اور اپنے ردعمل کو غیر حقیقی پن کے ساتھ قلم بند کر دیا۔ حقیقی دنیا میں اگر خوشیا واقعی دلال ہوتا اور کانتا اس کے سامنے یوں الف ننگی ہو گئی ہوتی تو وہ اسے وہیں دبوچ لیتا اور اندر چھپے ہوئے اس حیوان کی بات مان لیتا جو خواہش پر اکساتا ہے، اس لیے کہ ان پڑھ دلال کے پاس نہ پڑھے لکھے شاعر کے سے جذبات ہوتے ہیں اور نہ تاثرات اس کی تاپ کے پیمانے تو اس کے اپنے ہوتے ہیں جن میں قدروں، دلائل اور علوم کو دخل نہیں ہوتا وہ زندگی کی اعلیٰ اور ادنیٰ قدروں میں تمیز نہیں کرتا۔

افسانہ لکھنے کے بارے میں جو تفصیل منٹو کے یہاں ملتی ہے اس سے بھی اس کی ذہانت جھلکتی ہے اس کا یہ کہنا کہ میں قلم دوات سنبھالتا ہوں کاغذ پر ۷۸۶ لکھتا ہوں اور پھر تین بار کہتا ہوں افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے کیا لکھوں، کیا لکھوں۔ کہہ کر افسانے کا پہلا ابتدائیہ جملہ لکھتا ہوں اور پھر کچھ دیر سوچتا ہوں، سگرٹ پیتا ہوں۔ یا کہیں تھوڑی دیر کو ٹہلنے چلا جاتا ہوں، اور کچھ دیر میں واپس آکر بس لکھنے لگتا ہوں اور لکھتا چلا جاتا ہوں یہاں تک کہ آخری جملہ ہو جاتا ہے اور افسانہ مکمل ہو جاتا ہے اس تفصیل اور وضاحت میں اس کے افسانوں سے بھی زیادہ افسانوی رنگ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو کے افسانوں کا آغاز انجام اور درمیان سارے مراحل اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ کافی سوچ سمجھ کر افسانے لکھتا تھا۔ اس کا خلاق ذہن ہمہ وقت تخلیق کے جان لیوا مراحل سے گزرتا

تھا، اسی مسلسل عمل اور اسی ذہنی کرب کو کم کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو غرق مے ناب کرتا تھا تاکہ ذہن کو کچھ دیر ہی کو سہی، تھوڑا سا آرام تو مل جائے اور پاسبان عقل سے تھوڑی ہی دیر کو سہی پیچھا تو چھوٹے یوں تو ہر دم عالم ہوش میں میں رہ کر شاید اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جاتیں اور پھر وہ اتنے دن بھی زندہ نہ رہتا جتنے دن کثرت شراب نوشی کے باوجود جیا۔ شراب سے اس کو ایک گونہ تسکین ملتی تھی اور وقتی طور پر اس کو وہ آسودگی نصیب ہو جاتی تھی جس کا وہ متمنی تھا۔

افسانہ لکھنا اس کی روزی تھا جس کا اعتراف خود اس نے یہ توجیہ کر کے کیا ہے کہ اگر میں افسانہ نہ لکھوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کپڑے نہیں پہنے یا غسل نہیں کیا۔ میں افسانہ نہیں لکھتا بلکہ افسانہ مجھے لکھتا ہے۔ وہ زندگی بھر موم کی شمع کی طرح پگھلتا رہا خود راکھ ہو کر جو چنگاریاں اس نے اردو ادب کو دی ہے وہ شعلہ جوالہ سے کم نہیں ان میں ایسا زہر سرایت کیا ہوا ہے جس پر آب حیات کو بھی قربان کیا جا سکتا ہے۔ اس نے سماج کی برائیوں پر سے نقاب اٹھا کر سماج کا اصلی روپ دکھایا ہے۔ آج ان لوگوں کی گردنیں بھی ندامت سے جھکی ہوئی ہیں جو اس کی حیات میں ایسے فقرے کستے تھے کہ منٹو کی فحش نگاری اور عریاں نگاری سے ادب اور ملک کو بچانا چاہیئے۔

منٹو کی زندگی میں تضاد تھا لیکن اس تضاد سے افسانے کو فائدہ ہی پہونچا منٹو نے اس سے کام لے کر فن کی عظمت کو چار چاند لگائے ہیں۔ لیکن وہ بزدل تھا ان معنوں میں کہ وہ اپنے تحفظ کی خاطر زندگی بھر بھاگتا رہا اسی فرار نے

اسے پاکستان پہنچایا۔ وہ پاکستان اس لیے گیا تھا کہ اس کے دانت بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی بھر کی کمائی پر تھے۔ یہ خود غرضی اور خود فریبی منٹو کی زندگی کا کمزور ترین پہلو ہے وہ اپنے مستقبل کی فکر میں زندگی کی اعلیٰ وارفع قدروں کو پامال کرتا ہوا پاکستان چلا تو گیا لیکن قدرت تو چاروں طرف سے گھیر کر مارتی ہے ہونی کو بھلا کس نے روکا ہے۔ وہی ہو کر جو اس کے مقدر میں تھا۔ پاکستان جا کر منٹو کا جو حشر ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔

منٹو کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ تاش کی محفلوں سے لے کر شراب کے اڈوں تاڑی خانوں، چکلوں، کٹرہ گھونیاں، ہیرا منڈی، فارس روڈ اور چوک فرید کے ہر اڈے پر وہ خوب گھوما تھا، ان کے اندر گھس کر اصلیت کو سمجھنے کی کوشش کی تھی وہاں کی حقیقت جاننے کے لئے اس کی تہہ تک پہونچنے کے لئے اس نے خود کو اس دنیا کا ایک فرد تصور کر لیا تھا۔ وہ کہتا تھا اگر گناہ نہ کروگے شراب نہ پیو گے، گندگی کے قریب نہ جاؤ گے تو کیا خاک لکھو گے وہ دنیا کی ٹھکرائی ہوئی کوڑے پر پھینکی غلاظت میں سے بھی موتی چن کر نکال لیتا تھا، منٹو کے سماج کے عام طور پر اور طوائف کی زندگی کے خاص طور جو چھلکے اتارے ہیں یا جو کچھ ان کے بارے میں لکھا ہے ڈوب کر مشاہدہ کر کے اور تجربے کی بنیاد پر لکھا ہے اور با اصول یقین اور وثوق کے ساتھ لکھا ہے عام طور پر اچھے اور برے کو پرکھنے کے جو آنکڑے گڑھے ہیں انھیں توڑ پھوڑ کر اور گڈمڈ کر کے وہ اپنی تول اور ناپ سے ہر چیز کا اندازہ لگاتا تھا، اس نے عیش پرست طبقے اور کچلے ہوئے طبقے دونوں کی بھرپور عکاسی کی ہے اونچے طبقے کے اوپر جمی ہوئی بالائی تہہ کو

ہٹا کر اس نے سارے دودھ ہی کو پھاڑ ڈالا ہے اور اس طبقے کی روح کو بے نقاب کرکے اس کا سارا کھیل اور سارا ڈھونگ عریاں کر کے طشت از بام کر دیا ہے اور پسے ہوئے طبقے کی تصنع سے دور اصلیت کا بیان کر کے اس نے بڑی چابکدستی کے ساتھ بہت سی حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا کر صحیح بات کہنے کے انداز میں کہہ کر معاشرے پر احسان کیا ہے۔

عورت کے بارے میں اس کا مطالعہ بہت گہرا ہے لکھتا ہے آپ یقین کیجئے اگر میں عورت ہوتا تو میرے ہلکی پیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے مہین ڈوپٹے کے نیچے میرے سینے کا ابھار بڑا اچھا ہوتا اور جو کوئی مجھ کو دیکھتا ایک دھچکے کے ساتھ اس کی نظریں پلٹ جائیں مگر میں یقیناً ایسی چال نہ چلتا کہ لوگ اونچی ایڑی کے جوتے کو کچھ اور سمجھتے اور ایسا غرارہ نہ پہنتا جس کی سلوٹوں کا گھراؤ بھدا ہوتا میں اس طرح کبھی نہ سوتا کہ بڑی بڑی اداس آنکھیں بند ہو جاتیں اور دایاں بازو ایک طرف کو ڈھلک جاتا۔

منٹو نے بڑے سے بڑے نازک سے نازک اور چھوٹے چھوٹے موضوع پر بھی بڑی نفاست نزاکت اور فنی چابکدستی کے ساتھ افسانے لکھے ہیں۔ اس کے باوجود منٹو نے مرنے سے قبل جن دو خواہشوں کا اظہار کیا تھا وہ پوری نہ ہو سکیں پہلی خواہش تھی کرکٹ میچ دیکھنے کی اور دوسری آرزو تھی اس مظلوم عورت پر افسانہ لکھنے کی جس کی لاش امرت سر کی ایک سڑک پر برہنہ پائی گئی تھی اور جس کے ساتھ بارہ ہوس پرستوں نے اپنی بہیمانہ خواہش کی تکمیل کر کے اسے یونہی سڑک کے کنارے اس طرح ڈال دیا تھا کہ اس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔

منٹو بہت صاف گو، بے باک، نڈر اور سفاک مبصر تھا، ریا کاری اسے چھو تک نہ گئی تھی، حقیقت بیانی میں چاہے اسے جتنے ذہنی کرب سے گزرنا پڑے چاہے جس آگ سے گزرنا پڑے، پرواہ نہ کرتا تھا۔ اس کی زندگی کھلی ہوئی کتاب تھی۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ دنیا کی نظروں سے اوجھل نہ رہا۔ اس نے کبھی جذبات کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیا، اس کے نزدیک زندگی اور موت کے درمیان حدِ فاصل بہت ہی مبہم اور غیر واضح تھی، اسی لئے وہ زندگی اور موت کا بیان ایسے کرتا تھا جیسے ان دونوں کی حقیقت اور اصلیت سے وہ پوری طرح واقف ہو اس کے باوجود اس کے افسانے نہ محض حسن و جمال کے مظہر ہیں اور نہ خالصتاً برائیوں کی پوٹ، اور نہ نقش نگاری کے بیکار پلندے۔ اس کے افسانوں پر عریانیت کا ٹھپہ لگا کر اور گندے ذہن کی گندی پیداوار کہہ کر ان کی قدر و قیمت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے تو شگفتہ انداز، مزے دار فقروں اور الفاظ کے فنی دروبست سے زندگی کی ایسی حقیقتوں کو جو معاشرے اور سماج کے لئے مضرت رساں تھیں۔ من و عن جوں کا توں بغیر ملمع سازی کے بیان کر کے بے باکانہ حق گوئی کے فرض کی ادائیگی کی ہے جو اس معاشرے کے سدھار کے لئے ضروری تھا۔

منٹو کے موضوعات بھی گوناگوں اور کردار اسی دنیا کے جیتے جاگتے اور گوشت پوست کے زندہ و تابندہ ہیں اور اسی زمین سے پھوٹے ہیں آسمانی مخلوق نہیں معلوم ہوتے۔ کلرک، مزدور، رند خرابات، زاہد پاکباز کی زندگیاں ان کی خوبیاں اور خامیاں، امرتسر، کشمیر، دلی، بمبئی، لاہور

علی گڑھ، فلم اسٹوڈیو، کالج بازار اور گھر میں پھیلی ہوئی زندگیوں کا بیان ہوٹل، چائے خانوں، تاڑی خانوں، شراب خانوں اور مختلف قسم کے اڈوں پر جو کچھ ہوتا ہے اس کی صحیح دو ٹوک اور واضح عکاسی ہے۔ بوڑھوں، جوانوں مرد اور عورتوں کی ذہنی الجھنوں، جنس اور اس کے گوناگوں مظاہر کا بیان منٹو نے خوب کھل کر کیا ہے ان میں سے کچھ موضوعات ایسے ہیں جن میں منٹو زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتا ہے زیادہ سرشار نظر آتا ہے اور کچھ موضوعات میں قدرے وہ انہماک نہیں ہے لیکن وہ جہاں جاتا ہے جس چیز کا بیان کرتا ہے اس کے سارے پیچ و خم سارے بھید اندرونی کیفیتیں، نزاکتیں، لطافتیں، کمزوریاں، خوبیاں، خامیاں اور ساری جزیات، پر اسکی شدید گرفت ہوتی ہے فن، اس کا اظہار ترسیل و ابلاغ اور اسلوب کے اجزائے ترکیبی سے وہ کما حقہ واقف ہی نہیں ہے بلکہ ان سب پر قادر ہے اور اسی لئے اس کے عمیق مشاہدے سے چھوٹی سے چھوٹی بات باریک سے باریک تہہ بھی چھوٹنے نہیں پاتی۔ فن کے ابتدائی مطالبات، اصول و قوانین اور اس کی روایت کو سمجھ کر منٹو نے فن کو کامیابی سے برتا ہے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے میں ذہنی کاوش توجہ انہماک سے کام لیا ہے اور اسی لئے کامیابی ہر گام پر اس کے قدم چومتی ہے اس کی ہر کہانی کی بھرپور دادملی ہر اس کی کہانیاں لمبی بحردں میں کہی گئی غزلیں ہیں۔

افسانہ، داستان، ناول، ڈرامہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کی رو سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں افسانے میں

ان سب کے برخلاف موضوع کی اکائی امتیازی حیثیت رکھتی ہے وحدت تاثر افسانہ کا اصل الاصول ہے ٹکنک کو نظر میں رکھ کر اور اظہار و ابلاغ کے وسائل سے فنی احتیاط کے ساتھ کام لے کر اپنی شخصیت کا مظاہرہ کرنا اور انفرادیت کو منوا لینا، افسانہ نگار کی اپنی ذہانت پر منحصر ہے۔ منٹو نے ایک کردار، ایک واقعہ ایک ذہنی کیفیت ایک جذبہ اور ایک مقصد والی بنیادی اور لازمی ٹکنک اپنا کر افسانے کو بہت جاندار بنایا ہے پریم چند افسانے کی خصوصیات کو پیش نظر ضرور رکھتے ہیں لیکن جب وہ جذبات کی رو میں بہہ کر مغلوب ہو جاتے ہیں تو قابل رحم نظر آتے ہیں۔ انھیں فنی نقطۂ نظر سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے منٹو کے یہاں افسانوی ادب و فن کے سارے مدارج موجود ہیں جن کو کمال صلاحیت کے ساتھ جذباتیت پر غلبہ پاکر برتا گیا ہے۔

منٹو کی قبر پر نصب کنندہ کتبہ بھی ان کی خود اعتمادی کے ثبوت کے لئے کافی ہے "یہاں سعادت حسن، منٹو دفن ہے اس کے سینے میں فن افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے۔ سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے، یا خدا" صدیوں سے سوئی ہوئی روحوں کو خواب سے چونکانے کے لئے اس نے دہشت پسندی کا راستہ اختیار کیا، علی گڑھ کے دور میں مرشد باری علیگ جن کو خلیفہ کہا جاتا تھا جیسے چار دوست تھے جن کے ساتھ "والٹر، روبیو، مارکس لینن، ٹراٹسکی اور اسٹالن کی ہمنوائی کی جاتی تھی" اس کے بارے میں ایک جگہ منٹو نے لکھا ہے۔

"ہمارے خلیفہ یعنی باری صاحب اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم چاروں اس زمانے میں ان کھلونوں سے جی بہلانے کے جرم میں پھانسی پا گئے ہوتے۔"

اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو آج اردو افسانہ اپنی سمت کے لئے راہیں بھی تلاش کر رہا ہوتا اتنا توانا اور جاندار نہ ہوتا جتنا آج ہے۔ نیا قانون، خوشیا، نعرہ اور نیا سال پڑھتے وقت بے شمار نقوش ان گنت تصویریں اور لاتعداد چیزوں کے بہت سے عکس اور ان سب کی جزئیات کیفیات اور حسیات سب سامنے آجاتی ہیں اور آخر میں واقعاتی اور نفسیاتی رنگا رنگی کے باوجود خاص تاثر کے طور پر صرف مرکزی کردار کی مخصوص ذہنی کیفیت رہ جاتی ہے۔

ہتک میں مخصوص ماحول اور فضا اور اس میں کرداروں کی انفرادیت کے بہت سے خاکے ابھرتے ہیں، اس کے باوجود یہ اس کی اصلی ہیروئن سوگندھی کے کردار کی مکمل تصویر ہے۔ فنکار کے مشاہدے، تخیل اور فکر کی ساری قوتیں بھی اسی کردار کے بنانے سنوارنے اور مکمل کرنے میں صرف ہوتی ہیں۔

کالی شلوار کا آغاز و انجام واقعات کا اتار چڑھاؤ اونچ نیچ اور ایک شدید قسم کا نقطۂ عروج قاری کی توجہ معاشرے میں پھیلی ہوئی گندگی اور گھناونے پن کی طرف مبذول ضرور کراتے ہیں اور اسے نفسیاتی محرکات میں مزا بھی آتا ہے لیکن نظر وہیں ٹھہر کر نہیں رہ جاتی بلکہ جو مجموعی تاثر اس کے ذہن میں بیٹھتا ہے وہ ان تمام محرکات کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور ایک مضبوط زنجیر میں آغاز سے انجام تک تمام ٹکڑوں کو چابک دستی کے ساتھ جوڑنا یہی فن ہے اور یہی فن کی انتہا۔

منٹو نے افسانے کی ساخت، ترتیب، رفتار، اتار چڑھاؤ کو کمال دیانتداری

کے ساتھ برتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان جن جاں سوز مراحل سے منٹو کو گزرنا پڑا ہوا ہوگا۔ یہ کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کے سینوں میں حساس دل، شعور کی پاکیزگی اور رگوں میں تازہ اور صاف خون ہے اور جن کی فن کے مبادیات پر نظر ہے منٹو نے زندگی سے خراج لے کر روح و بدن اور نفسیات کی باریک سے باریک نس کو دیکھا پرکھا اور برتا ہے اور سمیٹنے کے بعد قدرت بیان انداز فکر کی ندرت اور مزاج کی بھرپور زہرناکی اور زبان کی چاشنی کے ساتھ کہیں سادگی زبان سے کام لے کر کہیں تضاد و تکرار کی مدد سے اور کہیں مشاہدے اور بصیرت کے بل بوتے پر جو کچھ لکھا ہے اسکے لفظ لفظ اور ہر لائن پر اپنی شخصیت کی انفرادی چھاپ چھوڑی ہے۔

نیا قانون منٹو کا معرکتہ الآرا افسانہ ہے جن کا انجام بالکل فطری معلوم ہوتا ہے۔ استاد منگو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے راستے کے درمیان اور تھانے کے اندر وہ نیا قانون نیا قانون چلاتا رہا۔ مگر کسی نے ایک نہ سنی نیا قانون نیا قانون کیا بک رہے ہو۔ قانون وہی ہے پرانا اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اس افسانے کی طرح منٹو کے بیشتر افسانوں کے اختتام کی نفسیاتی جذباتی اور فنی حیثیت ہے۔ موذیل کی پہلی لائن اس طرح شروع ہوتی ہے "ترلوچن نے چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور آخری لائن اس جملے پر لے جاؤ اپنے مذہب کو" پر ختم ہوتی ہے۔ یہ باہمی ربط ایسا ہے جو منٹو کی فطانت پر دلالت تو کرتا ہی ہے۔ فن کو بھی عروج بخشا ہے وہ بندوق سے مذہب کا شکار نہیں کرتا بلکہ اس کا خول اتارا ہے۔

بلاؤز شباب کی نازک اور جاں گداز منزل میں قدم رکھنے والے مریض کی اس جنسی بیداری کی کہانی ہے جس کے معنی اسے خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ منٹو نے اس نفسیاتی افسانے میں فنی ترتیب اس کے افعال اس کے ارتقا اس کے منتہا اور اس کے انجام اور پھر ان سب کے باہمی ربط و توازن میں ایک خاص تصور کی تکرار کو فن کی بنیاد بنا کر سادگی، بیان و زبان کے ساتھ ایسی کہانی پیش کر دی ہے جو کم ذہانت والے آدمی کے بس کی بات نہیں جس کا لہجہ منفرد اور تیور بڑے تیکھے ہیں۔

تاثر انگیزی منٹو کے اس اسلوب نگارش کی ایک اور خاص خوبی ہے۔ ابلاغ و ترسیل کے جو طریقے منٹو نے اپنائے ہیں وہ غیر معمولی ہیں۔ فقروں کی معمولی سی تبدیلی لفظوں کو برتنے میں جدت پسندی بڑی اور گہری بات کو سیدھے سادے انداز سے پیش کر دینے کی صلاحیت اظہار پر بے پایاں قدرت کی مظہر ہے۔ بات کو سیدھے سادے انداز سے پیش کر دینے کی صلاحیت ہر ایک کے بس کی بات نہیں، ایک چھوٹے سے چلتے ہوئے معمولی جملے سے اپنے کردار کی ذہنی سطح اور مزاج کی پوری کیفیت کی ترجمانی کر دینا کچھ منٹو ہی کے جدت پسند اسلوب کا کرشمہ ہے۔ بازاری عورت کے کردار کی عکاسی اسی کے طبقے کے لحاظ سے اس خوبی سے بیان کرنا کہ اس جماعت کی ساری خبریات پوری طرح بے نقاب ہو جائیں اور اس انداز میں کہ طوائفیت سے بالکل محبت نہ ہونے پائے برخلاف اس کے نفرت کا رنگ اور گہرا ہو جائے کچھ آسان کام نہیں ہے لیکن منٹو شدید سے شدید جذبے کا اظہار معمولی سے معمولی لفظ سے اس طرح کر دیتا ہے کہ اس کی معنویت میں کئی گنا اضافہ

ہو جاتا ہے اس نے اپنے انداز کو عمومیت سے بچا کر الفاظ جملوں، تشبیہوں سے زندگی کے سارے احساسات میں قاری کو اپنا اور اپنے کمزور فکر کا ہمنوا اور گرویدہ بنا لیا ہے۔ منٹو کا استعمال کردہ لفظ جملہ اور تشبیہ پڑھنے والے کے تصور کو زندگی کی ایک موج اور ایک لہر دے کر ایسی تصویر بناتا ہے جس کا ہر رنگ تیکھا اور ہر نقش واضح اور متنوع لیے ہوئے ہے۔

منٹو نے تکرار اور تضاد کو جذباتی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ہماری سیاسی معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں قدروں کا جو تضاد ہے منٹو نے اسے ہمیشہ حیرت اندیشے اور تشویش سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ سیاست معاشرت اور دین اخلاق پر اس کی نظر گہری ہے، اسی لئے اس سے چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی آنکھ بچا کر نکل نہیں پاتا۔ وہ واقعہ یا کردار کے نقش کو ابھارنے کے لیے جزیات کے بیان کو لازمی سمجھتا ہے۔ واقعہ کی مصوری کرنے، ماحول یا فضا کا بھرپور تاثر قائم کرنے یا کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیت دکھانے کے لئے منٹو نے ان جزئیات سے کام بھی خوب نکالا ہے۔ تکنیک کے مبادیات زبان و بیان، اظہار و ابلاغ کے وسائل زندگی سے متعلق صحیح اور واضح مشاہدے اور ایک خاص تجزیہ کی تفصیلات میں موزوں جزیات کا انتخاب کر کے منٹو نے فن کی بھی لاج رکھی ہے اور افسانے کو فن اور موضوع کے اعتبار سے عروج بھی بخشا ہے افسانے کو آسمان پر بٹھانے میں منٹو کا نمبر تمام افسانہ نگاروں میں سرِ فہرست رہے گا۔

آخر میں قیام پاکستان کے دوران منٹو کا قلم قدرے سست اور ٹھس ہو گیا تھا اور یہ اس لیے ہوا کہ اس کی بے قدری بہت ہوئی اور وہ نہ اپنی انا کی ٹیس برداشت

کر سکتا تھا اور نہ بے قدری جھیل سکتا تھا، اس کو حالات کی معاشی بدحالی نے اور پھکڑ پن نے جھکنے پر مجبور کر دیا اور وہ مجبوراً انسانیت کے درجہ اور اسکی اصلی سطح سے بہت نیچے اترنے پر طوعاً و کرہاً مجبور ہو گیا اور لوٹ گیا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا بکھر گیا، اور ایک ایسا افسانہ لکھنے کی حسرت لئے اس فریب آگیں دنیا سے کوچ کر گیا جس میں وہ سماج معاشرے اور مملکت پاکستان کے تمام پکتے اور رستے ہوئے ناسوروں پر نمک پاشی کر سکتا اور اس کا تمام پول کھول سکتا۔

منٹو نے اردو افسانے کو لفظی منافقت، فلسفہ طرازی اور تاریخ نگاری سے بچا کر وہ زبان دی ہے جس کا یہ متحمل ہو سکتا تھا۔ منٹو نے افسانوی ادب اتنا کچھ دیا ہے کہ اسے نہ کبھی فراموش کیا جا سکتا ہے اور نہ نظر انداز اس کے فن پر اس کی تمام کمزوریاں قربان کی جا سکتی ہیں ضرورت ہے کہ ہم اس کے فن کو آگے بڑھا کر انسانیت کی اعلیٰ و ارفع قدروں کی سلامتی اور تحفظ کے لیے کام کریں اور ایسا ادب تخلیق کریں جس سے زندگی کے حسن میں اضافہ ہو سکے، منٹو کا اسلوب براہ راست انداز بیان کے زمرہ میں آتا ہے، منٹو کی زبان بنیادی اردو سے قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ قریب ہے اور موجودہ افسانے کی زبان بن سکتی ہے رمزیہ انداز بیان کی روایت کے لئے نئے افسانہ نگاروں کو قرۃ العین حیدر اور بیدی سے استفادہ کر کے خود بھی بہت ریاض کرنا پڑے گا، تبھی ہمارا افسانہ عالمی ادب سے آنکھ ملا کر بات کر سکے گا، منٹو سے اس سلسلے میں کافی مدد لی جا سکتی ہے۔

مخدوم کی شاعری اور شخصیت

مخدوم اپنی اردو شاعری کے سہارے اس لئے زندہ رہیں گے کیونکہ انہیں تہہ صلیب بھی جینا عزیز رہا مرتے وقت تک ان کا رشتہ زندگی کے کرب کے ساتھ استوار رہا۔ ان کی شاعری اور زندگی کی مختلف جھلکیوں سے پتہ چلتا ہے کہ خلوص اور محبت ان کی زندگی کے سارے شعبوں پر چھایا رہا وہ محنت و محبت اور انسان دوستی کے کاز کو فروغ دینے والے خوش آیند مستقبل کے جویا شاعر تھے۔ یہ لفظوں کا خالق اور معنی کا مسیحا اپنی آتش نوائی کے ساتھ ساتھ ایسی چشم نگراں بھی رکھتا تھا جو اس کو اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام دلواتی ہے۔

"سرخ سویرا" "گل تر" اور بساط رقص ان کے ۔ ی سفر کے تین تابندہ اور پائندہ نقوش ہیں جو ان کو ہمیشہ زندہ و ۔ رندہ رکھیں گے۔

حیدرآباد کے ایک معمولی گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے ابھی چار سال بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ یتیمی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ بچپن بچپن کی طرح گزارنے کا موقع نہ ملا۔ بچہ ذرا بڑا ہوا تو اردگرد غربت کا مہیب اندھیرا دیکھا۔ مذہبی ماحول نے کچھ حدوں میں باندھ دیا مجبوراً مسجد کی جاروب کشی اور ادھر ادھر کے ٹکڑوں پر ایک عمر بسر ہوگئی تعلیمی سلسلہ چلتا رہا۔ ذہن متجسس شہر لے آتا ہے اور یہاں بے سروسامانی انکی مونس دم ساز ہے اور افلاس سرپرست ہے جوں توں کر کے تعلیم کا ایک دور مکمل ہوا لیکن ضروری تو نہیں کہ تعلیم معاش کی ضمانت بھی دے۔ دماغ کچھ فیصلہ کرتا ہے اور اب سامنے وسیع و عریض میدان کارزار ہے عوامی جد و جہد کا سیاسی سرگرمی کا مزدوروں کی شیرازہ بندی کا عوامی تحریک کی رہنمائی کا۔ پھر یہ میدان سیاست میدان کارزار بن جاتا ہے تیغ و تفنگ آگ۔ گولہ۔ بارود پولیس دست بدست مقابلے۔ کھیتوں پر ناجائز قبضے کسانوں پر مظالم عوامی نظم و نسق کی تباہی و بربادی کیمپ۔ قتل۔ خون۔ پھانسیاں۔ جسمانی اور ذہنی اذیتیں۔ نت نئے بھیس ریاکاری۔ مخبری۔ پابندیاں۔ مجبوریاں۔ رہائیں۔ اور ان سب میں مخدوم پیش پیش ہیں۔ ہر تجربہ نیا اور ایک زندگی سے کم نہیں اور وہ نام جو گمنامی کی اندھی وادیوں میں مخفی تھا۔ بے نام تھا۔ اب ایک ایسا نام بن کر ابھرتا ہے جسے لاکھوں افراد اپنا نام جانتے ہیں۔

مخدوم کی زندگی اور فکر تین محوروں کے گرد گھومتی ہے ابتدا میں ماحول

کی گرفت ہے مذہب کے مروجہ عقائد و مسلمات ہیں دوسرے مرحلے میں
باطنیت ابھرتی ہے اور روحانی تڑپ عقیدے کی جستجو بن جاتی ہے ناسازگار
اور نامساعد حالات کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑی تو ذہنی کرب نمایاں ہوا۔ مروجہ
اقدار اور تصورات پر شک کی نگاہ ڈالی گئی مذہب اور مذہبی رسوم سے گریز
کر کے ان کو تمسخر اور طنز کا نشانہ بنایا گیا۔ فطرت کی شوخی۔ طباعی۔ ذہانت
اور خوش دلی عود کر آئی فطانت و ذہانت نے شاعری کی طرف آنکھ بھر کر
دیکھا۔ اور مزاج نے اس کو کبھی نہ چھوڑنے کے لئے اپنا لیا۔ مطالعہ مشاہدہ
ژرف نگاہی اور تجربہ بڑھا تو عقل نے مارکسزم کے نظریہ کو قبول کر لیا۔ اسطرح
کہ وہ زندگی کے آخری لمحہ تک پورے پورے کمیونسٹ رہے کمیونزم کی تحریک
میں انقلابی تبدیلیوں انتشار بدنظمی اور افراتفری نے اس طرف سے بھی
بے اطمینانی اور بے یقینی کا اظہار کیا۔ بعد میں اس عقیدے پر بھی شکوک و
شبہات کی پرچھائیوں نے اپنا چھاپہ مارا عقل کے سہارے پر بھی اعتماد متزلزل
ہو گیا اور آخر آخر ایک سوال رہ گیا؟ اور یہ سوالیہ نشان آخر تک قائم رہا۔

پہلا دوشالہ نظم سے مخدوم نے شاعری کا آغاز کیا۔ لیکن یہ مزاحیہ انداز
جلد ہی سنجیدگی میں بدل گیا۔ حسرت کی غزل کا جادو اور ان کے عشق اور
معصومیت کی تازہ کاری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اختر شیرانی اور جوش کی
رومانی انقلابیت کی تیز لہریں بھی ساحل پر سر مار رہی تھیں مخدوم نے جلد ہی
حسرت اور اختر شیرانی کو طاق پر رکھ دیا اس لئے کہ وہ عشق میں سطحیت
کے نہیں جذبے کی گہرائی اور فکر کی کارفرمائی کے قائل تھے جس کے ثبوت میں

ان کی شاعری کا بیشتر حصہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ مخدوم کے ابتدائی جذبات شعری بھی اختر کے افلاطونی عشق سے مختلف چونکا دینے والے اور جاندار ہیں۔

فضا میں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوئیں
جو چھو لیتا میں اسکو وہ بہا جاتا پسینے میں

یہ جسمانیت کا براہ راست تجربہ ہے جو جوش کی جسمانیت سے بھی ایک حد تک مختلف ہے جوش نے رومان کا جسمانی تصور عام کر کے اعلان کیا کہ قلعے اور عورتیں جیتنے کے لئے ہیں رانی جھترانی۔ مزدور ن کھکارن وغیرہ وغیرہ انسانی وجود کے بجائے مرد کی ہوس کا آلہ کار ہیں۔ عورت کو مرد کی بھوک جذبات کا آلہ اور معروض محض سمجھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ محبت کے متعلق غیر فطری اور بیمار تصورات شاعری میں در آئے شروع شروع میں مخدوم بھی جوش کی گھن گرج کی زد میں آکر چوندھیا گئے اور کچھ دور اسی راہ پر چلے لیکن جلد ہی سنبھل گئے۔ مجموعی طور پر محبت کی تقدیس اور معصومیت کے قائل رہے۔ لوح دار کھنک اور آواز کی نغمگی پر جان چھڑکتے رہے۔ لیکن وہ اپنے ہم عصروں کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ شاعر اپنی محبوبہ کو چھوٹے پندار اور پدرانہ شفقت سے نصیحت کر کے اسے گھر لوٹ جانے کو کہے اس لئے کہ اس میں انقلابی کے ساتھ چلنے کی سکت نہیں ہے وہ شاعر جو انقلاب سے فرصت پاکر لوٹ آنے تک محبوبہ کو منتظر رہنے کی دعوت دیتا ہے وہ مخدوم کی نظر میں ذہنی مریض ہے مخدوم کا مشاہدہ اور زاویہ نظر اس ذہنی بیماری سے انہیں دور رکھتا ہے انکا

عشق اور زندگی کا تصور اور سماجی کشمکش کا شعور صحت مند ہے اسی لئے وہ نہ تو تاج محل کو استحصال کی علامت سمجھ سکے اور نہ طوائفوں کے قدموں پہ سجدہ کرنے کو انقلابیت کہہ سکے ان کی نظر میں سجدے کا بھرم ہے وہ کیفی اعظمی کی طرح سجدوں کو نہ چوکھٹ پہ بجانے کی تلقین کرتے ہیں اور نہ ان کے ساتھ آوارگی کے لفظ کا استعمال کر کے گستاخی کے مرتکب بنتے ہیں ان کی حدود زندہ رہنے والی شاعری کی حدود ہیں وہ وقتی اور ہنگامی موضوعات سے گریز کرتے ہیں کہ یہی بڑی شاعری کی شان ہے ۔

مخدوم کے یہاں عشق اور اس کا تصور زیادہ انسانی فطری اور صحت مند ہے ان کے ہم عصروں میں فیض اور مجاز تک کے یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اپنی اپنی محبت پر نادم تھے ۔ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ ۔ یا تو اس آنچل کو ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا ۔ یہاں محبت جیسے گناہ معلوم ہوتی ہے ۔ انقلاب اور محبت کے اس بہکے ہوئے تصور کو مخدوم علیل اور بیمار تصور سمجھتے ہیں ۔ کیوں کہ مخدوم کا شعور حیات ان سب کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ۔ صحت مند اور حقیقت پسندانہ ہے وہ تو محبت کے جاندار فطری ۔ صادق اور توانا جذبے کو سماجی امراض کیلئے تریاق سمجھتے تھے ۔ مخدوم کی شاعری اپنے اندر زندگی کے کل اور وجود کے تجربات کی ہمہ گیری رکھتی ہے ۔ یعنی وجود کے عرفان اور زندگی کے مظاہر سے پوری طرح آگاہ تھے ۔

مخدوم کے ذہنی سفر کی تین منزلیں ہیں ۔ پہلی منزل پر تصوری رجائی

روحانیت ہے دوسری منزل پر زندگی کے تلخ حقائق سے ٹکرا کر روحانی تصورات اور مذہبی عقائد کا حصار ٹوٹتا ہے افسردگی اداسی کی حدوں کو پھاند کر شعور غم تک پہنچتی ہے۔ اب ان کی روح نظریات کی جستجو میں بھٹک رہی ہے اور تیسری منزل پر انہیں مارکسزم کا نظریہ مل گیا یعنی ان کی زندگی اور فکر کا سفر روحانی بھی ہے انقلابی اور سیاسی بھی اچھی اور بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے عمل سے اپنے نظریہ کو سچی اور گہری روحانیت میں بدل دیا ہے اور اسی وجہ سے وہ ترقی پسندوں کی انتہا پسندی سے محفوظ رہے ان کا کلام انتہا پسندانہ رجحانات سے اس وجہ سے پاک ہے کہ ان کے شعور کو کمیونسٹ جد و جہد کی بھٹی میں تپ کر نکھرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہی عملی پہلو ہے جس نے ان کی ہنگامی اور وقتی موضوع اور مسائل پر لکھی ہوئی نظموں میں بھی ایمان کی طاقت۔ عمل کی ہم آہنگی۔ سچائی۔ خلوص لگن اور یقین کی روح بھر دی ہے مذہب سے ہٹ کر انہوں نے اوہام پرستی۔ عقیدے کے کٹر پن کو نشانہ بنا کر انسان دوستی کی راہوں کو استوار کرنے کی کوشش کی اور کامیاب رہے۔

مخدوم کو بے رنگ جہد معاش۔ محرومیوں۔ ناکامیوں تشنہ آرزوؤں ناآسودہ خواہشوں مجروح خوابوں اور مقتول مقاصد کی تڑپ اور کسک نے ایک زندہ سلامت بنا کر ادب کی خدمت کرائی ہے مذہبی دشمنی اور شاہی بغاوت کے الزام میں اگر ایک طرف ان کی آواز پر پابندی لگی تو دوسری طرف عقیدے کی پختگی یقین کی قوت انسانیت اور زندگی کے حسن سے

بے محابا محبت اور وابستگی نے ان کے فن اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کردی۔ یہ اور بات ہے کہ اسمبلی سے جیل تک اور عملی سیاست میں ان کی عمر عزیز کے بہت سے سال تلف ہو گئے۔

مخدوم نے مارکسزم کے نظریہ کا عملی اطلاق فن کے ذریعے کیا ہے لیکن جب جب وہ اس نظریئے سے ہٹ کر آزادانہ اظہار خیال پر اترے ہیں تب تب ذہنی اور جذباتی کشمکش نمایاں ہوئی ہے اور پھر ہر عقیدہ اور ہر نظریہ اور مروجہ نظام ہدف سوال بن جاتا ہے سیاسی زندگی نے ان کے فن کو جلا اور ان کی شاعرانہ شخصیت کو نکھار بھی بخشا ہے اور ان کے دائرے کو بھی محدود بھی کیا ہے نظریوں کے حصار سے نکل کر جب ان کا انفرادی وجود تخلیق پر اترتا ہے تو خلوص دردمندی اور شدت احساس کے بہت سے جوہر کھلتے ہیں سیاسی زندگی اور سیاست کی سنگلاخ اور چٹیل چٹان کے باوجود انہوں نے اپنے آخری لمحہ وجود تک شاعری کو زندہ جوان نمو پذیر اور سرگرم اظہار رکھا اور کمال یہ ہے کہ ان کی بیشتر شاعری سیاسی نظریئے کی ترجمان ہونے کے بجائے پوری انسانیت کی عکاس معلوم ہوتی ہے۔ اور یہی ان کی شاعری کی جان ہے۔

مخدوم کے لہجے پر اقبال اور جوش کے لہجے کی چھاپ نے اپنا بھرپور اثر چھوڑا ہے۔ دراصل ترقی پسند تحریک کو فن کے آداب مخدوم ہی نے سکھائے ہیں ان کی پہلی نظم "باغی" جوش کی نظم کا چربہ معلوم ہوتی ہے اگر ظاہری ہیئت سے قطع نظر کر لی جائے تو جنگ کے خلاف نفرت کا شعور

خالصتاً مخدوم کا اپنا ہے جس میں شعریت اور غنائیت اپنے فنی دبت کے ساتھ موجود ہے ۔ مشرق اقبال کی نظم مشرقیت کی توسیع ہونے کے باوجود مشرق نہ حقیقت پسندانہ تصویر ہے اقبال اور جوش کے برخلاف مخدوم فاشستی فلسفے کے ظاہر سے مسحور ہونے کے بجائے اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور یہ یونہی نہیں ہے بلکہ اس میں تجربے اور مطالعے کی آنچ ہے۔

اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں۔ خواب اصحاب کہف کو پانے والی زمین اس زمین موت پر ور رہ کو ڈھایا جائے گا ایک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا نظم موت کا گیت جوش کے سطحی انقلابیت کے لب ولہجے کے باوجود نئے اظہارات اور نئے امکانات کا اشارہ دیتی ہے ملک الموت کے چہرے کا تبسم دیکھو۔ جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں قبر کے پھاوڑوں کے داب کسے کہتے ہیں پھونک دو قصر کو گرگن کا تماشا ہے یہی زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ آؤ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں۔ کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

مجاز اور مخدوم دونوں پر جوش کی دہشت پسندی اور نراجیت کا اثر ہے مجاز کی آوارہ اس لئے زیادہ مقبول ہو گئی کیونکہ اس میں داخلی کشمکش ہے مخدوم کے یہاں سیاسی رنگ کی کارفرمائی ہے لیکن مخدوم صرف تخریب ہی میں نہیں تعمیر میں یقین رکھتے ہیں وہ جہان نو کی تعمیر کا ایک نسخہ بھی دریافت کرتے ہیں ایسا جہان نو جس کا اچھوتا نظام ہو۔ ایسا جہاں جس کا اخوت پیام ہو۔ ایسا جہاں جس کی نئی صبح وشام ہو ایسے جہان نو کا تو پروردگار بنا اور

اور نہ سوشلسٹ نظام اور سماج ہے یہاں نعروں کی گرج۔ مبلغانہ خطابت اور سیاسی فارمولوں کی سخت گرفت ہے شعریت اور روحانی تجربے کی آنچ میں کمی ہے آگے چل کر دردمندی کی تیز اور دہکتی ہوئی آنچ سے پگھلے ہوئے لہجے میں اثر آفریں "پرسہ" ہے جو بچے کی موت پر ماں کے حضور پیش کیا گیا ہے
نہ تری دعائیں نہ میری دعائیں + دعائیں بھی بے بس ہوائیں بھی بے بس
تری اور میری التجائیں بھی بے بس۔ نہ وہ اور نہ میں اور نہ تو جاودانی +۔
ازل سے مصور کا ہر نقش فانی۔ یہاں والدین کے داخلی تجربے کی شدت کارفرما ہے اگر ایک طرف موضوع کے اعتبار سے سیدھی سادی زبان استعمال کی گئی ہے تو دوسری طرف ماں کی مذہبیت کا پوری طرح احترام کرتے ہوئے عقائد سے اس کو تسلی وتشفی دے کر اس کی مغموم مجروح اور غمزدہ روح پر مرہم رکھا گیا ہے۔ ان کی کچھ بالکل خالص سیاسی نظمیں داخلی تجربے کی آمیزش سے خالی ہیں۔ یہ صرف سیاسی شعور کی غماز اور تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ دھواں۔ آزادی وطن۔ جہان نو۔ حویلی۔ ساقی۔ مستقبل قمر۔ روح فغفور۔ زلف چلیپا۔ جانبازان کیوبا۔ بنگال تلنگانہ اور ماسکو وغیرہ سب موضوعاتی نظمیں ہیں۔ تماشائی اور نیا چین میں ایمائیت کے ساتھ ساتھ لہجے کی تازگی ہے سیاسی انقلاب۔ اندھیرا اور اسٹالن مخدوم کی کامیاب ترین سیاسی نظموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں سپاہی میں دوسری عالمگیر جنگ کی بربریت کا مکمل خاکہ ہے اس نظم میں اثر آفرینی اور پرسوزی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ پیش بینی اور مستقبل کا اشاریہ ہے۔

جنگ کی ہولناکیوں کی المناکی کے باوجود اسکی پرسوز نغمگی اسے اس دور کی نظموں میں بڑا بلند مقام دلواتی ہے۔ انقلاب کی ایمائیت میں معنی خیزی ہے اس میں روحانی تصور ایک محبوب کا کردار بن کر ابھرتا ہے......
اے جان نغمہ یہ جہاں سوگوار کب سے ہے، ہجوم شوق سرراہ گزار کب سے ہے۔ گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے اس نظم میں مخدوم کا نظریاتی شعور۔ فرسودہ مروجہ اور ازکار رفتہ تصورات روایات پر بھرپور وار کرتا ہے۔ حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے اب تک سروں میں دین کا سودائے خام ہے اب تک تو ہمات کا آدم غلام ہے اب تک ابھی رکی ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار۔ نسیم عدل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے۔ اسٹالن اور اندھیرا ایمائیت سیاسی شعور اور رعنائی اظہار کے لحاظ سے اچھی نظمیں ہیں اب مخدوم الفاظ کی موسیقیت سے کام لینا سیکھ چکے ہیں۔ زبان و بیان سے زیادہ شاعری کی روح پر زور دیتے ہیں۔ اندھیرا کی تاریخی حیثیت اپنی جگہ پر ہے۔ یہ نئے فارم میں کہی گئی نظم ہے۔ یعنی ہیئت پرستی، اور لیبل پرستی سے ہٹ کر یہ ایک مسلمہ ترقی پسند کی پہلی آزاد نظم ہے اب مخدوم اپنے ابتدائی دور سے نکل آئے ہیں وہ پہلا مرحلہ جہاں تکنگن روحانی تصورات کا ہیولا ہے "سجدہ" اور انسانی لوریوں میں ماورائیت کا رنگ در دخن ہے "لمحہ رخصت" اور جوانی میں جسمانیت اور ارضیت ہے "باغی" میں مذہب کے تفرقوں سے بیزاری اور "..." میں انسانی عظمت کا رجز

ہے اب بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ ان کی روحانی نظموں میں تصور عشق تصوف کی روایت کے تابع تھا۔ مذہبی روایات ذہن پر چھائی ہوئی تھیں سرود سرمدی سے زندگی سرشار و مخمور تھی۔ تقدیس کے ترانے ہر سمت جاری و ساری تھے سرمدی نغمات سے ساری فضا معمور و مسحور ہے۔ سجدوں میں تعلق کا سا لطف آرہا تھا۔ پیشانی میں سجدوں کا طوفاں بپا ہے۔ یعنی سجدے مسرور تھے کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے۔ میرے مسجود میری روح پر چھانے والے آ بھی جاتا کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے۔ یہ سب عشق کی ماورائیت ہے۔ یہاں طرز فکر پر روحانیت کا گہرا اثر ہے یہاں زندگی اور فکر کا مطلع خدا ہے لیکن ان مذہبی تلازمات ہی نے عشق کو روحانی تجربہ بھی بنایا ہے۔ یہاں تصور شعر روایتی ہے۔ فردوس خیالی میں بیٹھا اک بت کو تراشا کرتا ہوں۔ پھر اپنے دل کی دھڑکن کو پتھر کے دل میں بھرتا ہوں۔ دلی پر لکھی گئی نظم کا ایک مصرعہ ہی ان کے تصور شاعری کے عکاسی کے لئے کافی ہے

وہ جبریل سخن وہ اول تلمیذ رحمانی ..... اور اقبال پر لکھی گئی نظم کی طرح ابتدائی فکر مذہب کی زائیدہ و پروردہ ہے۔ نغمہ جبریلی ہے۔ انسان کا گانا نہیں۔ صور اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں امت کا شب چراغ اندھیرے میں کھو گیا۔ یا پھر قلندر میں حرم کی لاش پر داؤد کے کے نغمے چھیڑتا جا۔ مذہب کے اثر کے علاوہ ابتدائی روحانی شاعری میں کہیں کہیں احساس کی آنچ۔ تجربے کی گہرائی۔ اور انفرادیت کا لہجہ بھی مل جاتا ہے یہاں جدیدیت کی تلاش ہے نئی پیکر تراشی کے ساتھ ملتے

ذہن کی نمائندگی ہے لیکن اس ابتدائی رومانی لہجہ پر جوش کا اثر نمایاں ہے

بھرنے لگے بازو تو ہوئے بند قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ

آنے لگی ہر بات پہ رک رک کے ہنسی اب
رنگیں توجہ سے گراں بار ہوئے لب

بات کیا تھی ذکر کس کا تھا کہ ہنگام بشارہ
مسکرانے والی آنکھیں ہچکیاں لینے لگیں

ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکر ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

نوخاستہ محبوب کا منھ چومنے والے
اس فصل میں بے بال و پری ہائے ستم ہے

جنوں کی لغزشیں خود پردہ دار راز الفت ہیں
جو کہتے ہیں سنبھل جاؤ سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا

اک ایسا غم جو آنسو بن کے بہہ سکتا نہیں
دل جسے محسوس تو کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں

اور کیا ہوگی کسی کی کائنات سال و سن
عشق کی دو چار راتیں حسن کے دو چار دن

خلوت رنگیں میں بھی ڈستا ہے دنیا کا خیال
جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال

اداس رات ہے افلاس ہے غلامی ہے
کفن سے منھ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر

اب ایسی آندھیاں آنے کو ہیں بدبخت عالم میں
قفس کا ذکر کیا سارا چمن اڑ جانے والا ہے

گھر کے ہر ذرہ سے ناسور کی بو آتی ہے
قبر کی عود کی کافور کی بو آتی ہے

اس کے بعد کے شعری تخلیقات میں اندرون کی کشمکش نے ان گنت سوالوں کا جنم دیا۔ کچھ عرصہ مستقل خاموشی چھائی رہی یہ سوالوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے فرار تھا۔ یا اس خاموشی کے پیچھے عملی مصروفیات تھیں ان دونوں باتوں کے پیچھے خاموشی کا راز مضمر ہے۔ سکون اور تنہائی کے فقدان اور خوابوں اور تمناؤں کو عملی زندگی میں دیکھنے کی تمنا نے انہیں کچھ دنوں شعر گوئی سے باز رکھا یا پھر ذہنی کشمکش اور روحانی اضطراب کے اظہار کو وہ اپنے سیاسی عقیدے کے خلاف سمجھتے تھے

یا پھر یہ بات تھی کہ اگر اس وقت کی دبی دبی آگ اور اس سے پیدا شدہ چنگاریاں شعر میں در آتیں تو وہ ان کے مسلک کے خلاف ہوتا۔ اسی لئے ان کی خالص سیاسی نظمیں بھی براہ راست سیاسی نعروں سے بچی ہوئی ہیں۔ ان کا آخری کلام ذہنی پیچیدگی اور روحانی کشمکش کا آئینہ دار ہے ان کی نظمیں براہ راست سیاسی نعروں اور سیاسی افراتفری سے بچی ہوئی ہیں لیکن سیلاب کے بند جہاں جہاں ٹوٹے ہیں۔ جہاں جہاں سیاسی عقائد کی گرفت ڈھیلی پڑی ہے وہاں تشکیک کی دھار بہتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مذہب۔ خدا اور کمیونزم سے ان کا تعلق جذباتی ہی رہا۔ وجود کے کرب اور ہر لمحہ کائنات اور اس کی اصل حقیقت سے ہم آہنگی کی بیقراری کے اظہار نے ان سے اچھے اشعار تخلیق کرائے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے جذبے اور احساس کی آگ کو ہمیشہ روشن رکھا۔ تشکیک بعد میں پیدا ہوئی۔ لیکن کہیں کبھی ان سب میں تناقض کا پہلو نہیں نکلتا۔ خدا اور مذہب کا جذباتی تعلق انکار و انحراف کے باوجود اپنی ابتدائی چھاپ کی وجہ سے ہمیشہ داخلی حقیقت کی علامت بنا رہا۔ خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے۔ الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہو۔ الٰہی ختم نہ ہو یار غم گسار کی بات۔ پیار کو انہوں نے خدا جانا اور مذہب سے خدمت خلق اور انسان دوستی سیکھی۔ انکار کی منزل بغاوت سے شروع ہوئی...... رسم کہنہ کو تہہ خاک ملانے دے مجھے۔ تفرقے مذہب و ملت کے مٹانے دے مجھے۔ رسوم سے بیزاری اور تفرقوں سے نکل کر حیات و کائنات کو ساتھ لے کر چلنے کا اثبات کرتا ہے۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اب سوڈ کے ساتھ خیال کی وحدت اور غزل کے فارم کی بجائے نظم کی وہ وسعت اور تنوع انہیں بھاتا ہے جو غزلیت زدہ نہیں ہے ہماری زیادہ تر نظمیں بھی غزلیت زدہ ہیں۔ اب ان کے توانا اشعار دوسرا رنگ اختیار کر چکے ہیں ؎

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی
اٹھا ہوں آنکھوں میں اک خواب ناتمام لیے

کسی خیال کی خوشبو کسی بدن کی مہک
در قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے

دلوں کی تشنگی جتنی دلوں کا غم جتنا
اسی قدر ہے زمانے میں حسن یار کی بات

تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یار غم گسار کی بات

تحفۂ برگ گل و بادِ بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

سنائی پھرتی ہیں آنکھیں کہانیاں کیا کیا
اب اور کیا کہیں کس کس کو سوگوار کریں

اٹھو کہ فرصت دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہم کنار کریں

کمان ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دید یار کریں

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

سیماب وشی تشنہ لبی بے خبری ہے
اس دشت میں گر رخت سفر ہے تو یہی ہے

اک شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبت پیمانہ رہی ہے

دھڑکا ہے دل زار ترے ذکر سے پہلے
جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

ان اشعار کو غزل کے فارم کو اچھی طرح برتنے کی پوری قدرت نمایاں ہے یہاں تاثیر کی وہ یکساں اور متنوع فضا ہے جس نے نشاطیہ اور افسردہ دونوں لہجوں کو ایک دوسرے میں مدغم و مربوط کرلیا ہے لیکن یہ فضا ہمیشہ قائم نہیں رہتی ۔ رنگ تبدیل ہوتا ہے فضا بدلتی ہے اور پھر جو لہجہ سامنے آتا ہے اس کی کھنک سے ساری فضا مرتعش ہو جاتی ہے ۔ خود تراشیدہ بُتِ نازآفریں میرا وجود ۔ مرے سجدوں کے لئے ہی وقف ہے میری جبیں ۔ میری اقلیم انا میں دوسرا کوئی نہیں " میں " کی یہ انا انسانی وجود ہے ۔ جس میں پوری انسانیت اور انسان دوستی کا دل دھڑکتا معلوم ہوتا ہے ۔ اور پھر ذرا آگے بڑھ کر مادیت کے فلسفے کی ترجمانی ہے لیکن ذوق سجدہ جس کی انمٹ چھاپ ابتدا ہی سے پڑ چکی ہے اب بھی باقی ہے آ بھی جا تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے ۔ انسان دوستی جو خدا پرستی سے پھوٹی ہے جنگ کی ہولناکی اور انسانیت سوز بربریت سے مجروح ہو کر کراہ اٹھتی ہے ۔ اور آفتاب رحمت دوراں طلوع ہو اور انجم حمیت یزداں طلوع ہو یزداں اور انسان اب ایک ہی حقیقت کے دو نام اور ایک روپ میں تبدیل ہو چکے ہیں اور یہ محبت اور اس کی تقدیس خدا بن کر جہالت کدہ میں آسمان سے اترتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ خدا کے عرش الفت سے اترنے کے ارادے ہیں ۔ زمین و آسمان کو ایک کرنے کے ارادے ہیں اور اسی محبت سے کچھ اور آگے بڑھ کر غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے ۔ فرسودہ نظام کو تہ و بالا کرنے اور استحصال حویلی کو مسمار کرانے کا کام لیا جاتا ہے ۔ محبت اگر اسٹالن کی زبان

ہے تو دوسری طرف سرمایہ داری کے خلاف مسلح جدوجہد کا آلہ بھی ہے اور نئے نظام کی تعمیر کی تمنا بھی ہے سپاہی کا زادِ سفر ہے اور انقلاب کی کیفیت کا نام بھی ہے۔ لیکن ایک موڑ پر آکر خواب ٹوٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور شک اپنے غوطے سے جھانکتا ہے نظم چارہ گر سوالیہ علامات کی نشانی ہے اور شک کا پہلا اظہار۔ اور اب اس تشکیک کی زد میں آزادیٔ وطن بھی ہے۔ کبھی مکمل خاموشی کی تلقین ہے۔ اور اسی میں بہتر ہے اور کبھی چپ نہ رہنے ہی کو وقت کا سب سے بڑا تقاضا سمجھا جاتا ہے۔

بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو

کتنی سنسان ہے یہ رہ گزر .... کوئی رخسار تو چمکے کوئی بجلی تو گرے لیکن اس بے یقینی اور شک وشبہ میں بھی محبت پر اٹوٹ ایمان ہے۔ لختِ جگر کی آواز......

محبت کو تم لاکھ پھینک آؤ گہرے کنوئیں میں۔ مگر ایک آواز پیچھا کرے گی۔ کبھی چاندنی رات کا گیت بن کر کبھی گھپ اندھیرے کی بجلی بنی بن کے۔ لیکن اس پر اداس پڑی دیکھ کر تشویش ہوتی ہے آپ میں ایک گرمیٔ احساس ہوا کرتی تھی نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی۔ مگر ادھر مکمل سکوت ہے۔ کوئی کسی کو بتاتا نہیں کہ کیا کھو دیا۔ اس خاموشی نے بیڑیاں پہنا دی ہیں قدم اور آگے بڑھاؤں تو کیسے۔ نظم "طور" پڑھ کر اس وقت کے ہم عصروں نے نئی پود کے اس شاعر کو جو دعائیں دی تھیں وہ اب اپنا اثر دکھا رہی ہیں وہ شاعر جس کا تصورِ عشق اپنے ابتدائی دور میں بھی دوسرے ہم عصروں سے ممتاز تھا۔ اب تو اور بھی تجربے کی

اونچ سے بلند سے بلند تر ہو گیا ہے ۔ جو خدا کے سامنے پیار کرنے میں بھی نہیں جھجکتا تھا جس کا خدا اتنا شفیق اور مہربان ہے کہ محبت کے اس پاکیزہ اور معصوم تصور پر اور اس کے نظارے پر خوش ہوتا تھا ۔ خدا بھی مسکرا دیتا تھا جہاں ہم پیار کرتے تھے ۔ رات بھر دیدہ نمناک میں لہراتے رہے سانس کی طرح سے آپ آتے رہتے تھے ۔ اس شعر کے خالق کے یہاں آگے بڑھکر بھی ہلکی ہلکی کسک ہمیشہ محسوس ہوتی ہے ۔ اب نہ وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آب رواں باقی ۔ مگر اس عیش رفتہ کا ہے اک دھندلا سا نشان باقی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی جیسے وہ خود ساتھ ہیں ان کی جدائی ساتھ ہے

لیکن ہر سطح پر انسان دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی پہلو حاوی ہے ان کے یہاں اخلاق کا تصور کتنا وہ متحرک اور فعال ہے جمالیاتی اظہار کو اپنا کر انہوں نے جامد اور روایتی تصورات کو بہت دور پھینک دیا ہے اظہار ذات کے ذریعے انہوں نے کائنات سے مطابقت پیدا کی ہے ۔ وہ ذات کو کائنات کے عرفان کا وسیلہ سمجھتے ہیں ان کا یقین ہے کہ کشمکش کا خاتمہ تخلیق کا جنازہ نکلنے کے مترادف ہے اور اسی لیے انہوں نے نئے تصورات و تجربات کی تلاش اور پرانے نظریات کی صداقت پرکھنے کا عمل آخری لمحہ تخلیق تک جاری رکھا انکی آخری نظم رت ہے اور اس کا یہ شعر اس کا ثبوت ہے ۔

اس گل اندام کی چاہت میں بھی کیا کیا نہ ہوا
درد پیدا ہوا درماں کوئی پیدا نہ ہوا

درماں کی تلاش تشکیک کا محور اور تخلیق کا محرک ہے گل ترکی پہلی

نظم قید ہے جس میں معاشرے کے تخلیقی محل میں فرد کی شرکت کے جذبے کا شدید اظہار ہے۔ کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور۔ خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے۔ اب ماضی ناکردہ گناہوں کی پاداش۔ حسرتوں اور زندگی کے اک اک عمل کا محاسبہ کرتا ہے اور یہی عرفان نفس انہیں کئی برسوں کی خاموشی توڑنے پر مجبور کرتا ہے اب معصوم روحانیت وجود کا گہرا تجربہ بن گئی ہے۔ اب محبت اور موت لازم و ملزوم ہیں۔ دو بدن اوس میں بھیگے چاندنی میں نہاتے ہوئے۔ جیسے دو تازہ رو تازہ دم پھول پچھلے پہر ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا صرف ماتم ہوئی۔ اس کے باوجود آج کی رات نہ جا میں زندگی کے مختلف اور متنوع تجربات کو محبت ہی کی آنکھ سے دیکھا گیا ہے۔ زندگی لطف بھی ہے۔ زندگی آزار بھی ہے ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے زندگی دید بھی ہے حسرت دیدار بھی ہے زہر بھی آب حیات لب و رخسار بھی ہے زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے آج کی رات نہ جا۔

مخدوم نے پہلے پہل سیاسی موضوع کو واضح ایمائیت کے ساتھ آزاد نظم میں داخل کر کے اس کی وسعت کو اور وسیع بنانے کی کامیاب سعی کی اور بالواسطہ اظہار کو اپنا ذریعہ بنایا اس طرح وہ میراں جی اور راشد سے بھی بہت آگے نکل گئے اور آزاد نظم کو محدود موضوعات سے باہر بھی نکال لائے سیاہی تصویری پیکروں کی زبان کے استعمال کی کامیاب کوشش ہے اب رات کے ماتھے پر آزردہ ستاروں کا ہجوم ہے اور خورشید درخشاں سرمایہ داری کا دیو

استبداد ہے۔ فرسودہ اور بے جان تصورات کے علایم ہیں۔ اندھیرا جنگ کی ہولناکی اور بربریت کی واضح اور صحیح علامت ہے۔ رات کے ماتھے پر لرزرہ ستاروں کا ہجوم۔ صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے۔ رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسٹالن جو بظاہر اور حقیقتاً ترجمہ ہے منفرد طرز اظہار کا شعری کارنامہ ہے جو اردو شاعری کے لیے بڑے کام کی چیز ہے یہ خبر صداقت انقلاب اور عوامی طاقت کی علامت ہے رزمیہ بیانیہ انداز میں لہجے کی ایمائیت نے ایسا رنگ بھرا ہے کہ عوامی جدوجہد کے علامتی ہیرو کی حیثیت سے اسٹالن کے کردار کی حیثیت کا صحیح تعین ہو گیا ہے بعد میں ایک شخصیت کے طلسم کے ٹوٹنے کے باوجود یہ شعری اظہار کی کامیاب نظم ہے انداز بیان کی تازہ کاری نئے لہجہ کے امکانات کی نشان دہی کرتی ہے۔

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں۔ کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے

کر دوں۔

ترنم بحروں اور لفظوں کی داخلی موسیقیت اور نغمگی کے خوش گوار فضا کے لیے مسافر۔ مستقبل ستارے، سپاہی اور جنگ آزادی جیسی نظمیں ہمیشہ زندہ و پائندہ رہیں گی۔ جنگ آزادی میں عام فہم الفاظ کے موسیقیت کے داخلی تجربے کی آنچ سے آمیز ہو کر ایسا نغمہ فضا میں ابھرا ہے جس کو ہندوستان گیر مقبولیت ملی اور جس کی نغمگی نے ایسا تاثر چھوڑا۔ جو دلوں پر نقش ہو گیا۔

گل تر میں رومان پرور سیاسی شعور کی کارفرمائی ہے۔ اس کی نظموں میں رقص اس نغمگی اور غنائیت کا بین ثبوت ہے اگر سرخ سویرا رومانی تخلیقی

رکھتا ہے تو گل تر کی نظمیں لہجے کی تلاش کی مثال ہیں۔ جن میں لہجے کا خلوص بھی ہے۔ دل سوزی اور یقین کی توانائی بھی ہے اور غنائیت کے ساتھ شاعرانہ صداقت کا ایمائی اظہار بھی ہے۔ اس لہجے میں تحت نغمہ کی سی کیفیت اور افسردگی ہے۔ یعنی مخدوم کے یہاں عشق و زندگی، سیاست اور شاعری کا رشتہ فطری صحت مند اور حقیقت پسندانہ ہے ۱۹۵۰ء تک جبکہ ان کے ہم عصروں کا شعری ارتقا ختم سا ہو گیا تھا۔ ان کے موضوعات محدود ہو کر رہ گئے تھے انکے نظریہ میں جان باقی نہ رہی تھی۔ تمام ہنگامی اور وقتی اور نام نہاد انقلابی موضوعات کی اہمیت ختم ہو گئی تھی اور شاعری میں سستی گھن گرج کا سارا بھرم کھل گیا تھا اور وقتی سحر کاری کا سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ اور یہ سب اپنے کو دہرانے لگے تھے ایسے وقت میں بھی مخدوم کا تخلیقی سفر تمام نہیں ہوا۔ اور ان کے موضوعات کے تنوع میں فرق آیا۔ برخلاف اس کے ان کے آواز کی بازگشت نے ان کے ہم عصروں کی آواز کو دبا کر اپنی اہمیت اور حیثیت کو تسلیم کرلیا۔ مخدوم کی شاعری تو ایک لحاظ سے فیض کے مقابلے میں نئے مزاج کی زیادہ ترجماں ہے سرخ سویرا کے بعد گل تر کی نظموں میں انہوں نے اپنا شعری عمل یکسر بدل دیا تھا۔ انکی شاعرانہ آن۔ شعری سج دھج۔ نفس مضمون حقیقت پسندی۔ ندرت اور جمالیاتی کیفیت اور اس کے تاثر کے لحاظ سے گل تر سرخ سویرا پر بھاری ہے اور بساط رقص ان دونوں کی ترقی یافتہ اور زیادہ نکھری ہوئی شکل ہے۔

وقت زیریں لہروں کی طرح کار فرما نظر آتا ہے۔ اب احساس کے

شعری پیکروں میں خوبصورتی ۔ اچھوتا پن اور جذبے کی آتش نوائی آگئی ہے
اب سیاسی نظریہ بھی انسان دوستی کا عشقیہ تصور بن کر ابھرتا ہے ۔

جب بھبک اٹھے تو دنیا کا بھبک اٹھتا تھا دل ۔ والگا
کا یانگ سی کا نیل کا گنگا کا دل ۔

" خواہش " وصال ۔ وقت ۔ بے درد مسیحا احساس کی رات اور سناٹا عشق کی مختلف کیفیات کی تصاویر ہیں ۔ یہ وہ عشق ہے جو تجربے کی آنچ میں تپ کر پروان چڑھا ہے ان تصویروں میں ان کے دل کا معاملہ کھلتا نظر آتا ہے ہر احساس کی آگ کو تیز اور روشن رکھنا چاہتے ہیں اور لمحۂ گزراں سے کسب نور اور کسب فیض منصب حیات تصور کرتے ہیں ۔ وہ قرب کے اس گزرتے ہوئے لمحہ کو اسیر کرنا چاہتے ہیں جو ان پر زندگی اور اس کی کلیت کا انکشاف کر رہا ہے ۔ چاند تاروں کا بن آزادی پر لکھی گئی بہترین نظم ہے رات کی تلچھٹیں ہیں ۔ اندھیرا ابھی ہے صبح کا کچھ کچھ اجالا بھی ہے ۔ ہم دیو ہاتھ میں ہاتھ دو سوئے منزل چلو منزلیں پیار کی منزلیں دار کی کوئے دلدار کی منزلیں ۔ دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو ۔ یہ آزادی کی جد و جہد محبت ہی کے تجربے کی توسیع ہے اور ہر کوشش ایسے معاشرے کے قیام کے لئے ہے جس کی اساس ہمہ گیر انسانی محبت پر ہے ۔ جس میں انسانی وجود کا شدید روحانی تجربہ شامل ہے ۔ موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن ۔ رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن ۔ رات بھر جگمگاتا رہا ۔ چاند تاروں کا بن تشنگی تھی مگر ۔ تشنگی میں بھی سرشار تھے ۔ پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لئے مردوزن بستیاں ختم

مدہوشیاں ختم ۔ ختم تھا بانکپن اور کبھی حریف قوت دلوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے رات کے جگمگاتے دہکتے بدن صبح دم ایک دیوار غم بن گئے خون نور سحر پی گئے ، یہ نفرت کے ہاتھوں محبت کے خون کی داستان ہے اس علامتی اسلوب میں غضب کی تعمیم ہے ۔ مخدوم کی تصویر کا کینوس وسیع ہے اور وہ فیض کی نظم یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں سے کبھی آگے نکل جاتے ہیں ۔ رقص ایک ایسی نظم ہے جس میں عشق کا والہانہ اور بے محابا اظہار ہے اور رقص کی تمام کیفیتوں سے غنایت کی ہم آہنگی عجب سحر سا کرتی ہے ۔ لفظ کا آہنگ پوری کیفیت کو مجسم شکل میں سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے. بدن تھاپ تھاپ کے چل ۔ کمر لچک لچک کے چل قدم بہک بہک کے چل وہ کام دیو کی کمان جام لے کے آ گیا اس کی بساط محدود نہیں ہے تمام کائنات پر بسیط ہے اس کے باوجود وہ اس کو اور بھی بسیط کرنے کی تمنا رکھتا ہے ۔ وہ خواب فردا کی دیوار کے سائے تلے دو گھڑی بیٹھ کر عشرت حال کی مے پینے کو غنیمت جانتے ہیں ماضی بھاری اور بوجھل سفر کے بوجھ سے گراں بار ۔ تھکا ہوا اور دبا ہوا ہے ۔ مضمحل افسردہ اور اداس ہے مستقبل ایک خواب ہے اس لئے حال عشرت کے لمحہ گزراں سے جتنی فرصت دیوانگی مل جائے غنیمت ہے ۔ یہاں پھر محبت کام آتی ہے اور اسی سے ہی ماضی کے دکھوں کا مداوا بھی کیا جاتا ہے اور مستقبل کے خوابوں کے لئے توانائی لی جاتی ہے مگر درد بے درماں کو کیا کیجئے ۔ لیکن یہ درد انہیں جان سے زیادہ عزیز ہے ۔

یادوں میں اک جام غم اور دو
رات کی تیرگی میں سوز گانی رہے

دل بڑھاتی رہیں ہاتھ کی نرمیاں پیار کی چاندنی جگمگاتی رہے۔ فاصلے میں عشق تشنگی حسرت محرومی سرشاری اور دل کی دھڑکنیں دبی ہوئی ہیں یہ شورش عشق اور فلسفہ زیست کی واضح تصویر ہے جیسے کسی پنہاں یا نہاں محرک نے اظہار کے لئے پیرایہ تراش لیا ہو انگریزی نظم کے مرکزی خیال کے تاثر پر تعمیر کردہ عمارت اپنی ہے اس میں ایسی کسک اور والہانہ پن ہے جس نے اس کو اصل سے بھی آگے نکال دیا ہے۔

چارہ گر کا موضوع زندگی بحیثیت کل ہے جس میں موت کا عرفان بھی ہے یہ بتا چارہ گر۔ تری زنبیل میں نسخہ کیمیائے محبت بھی ہے کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟ اجتماعیت کے تقاضوں اور اثبات انا کی کشاکش نے تشکیک کو جنم دیا لیکن ان سوالوں کا جواب آخر تک نہ مل سکا اور اگر ملا بھی تو نفی میں۔

مخدوم کی غزلیں اور نظمیں عصری مسائل اور فکری رویوں کی ترجمان ہیں وہ غزلوں میں کلاسیکی آداب اور نظموں میں جدید اظہارات کی حدود کو پھاندتے نہیں ہیں۔ حدود میں رہ کر انہوں نے اپنے روحانی تصور کی ترقی پسندی کے مطابق توسیع کی ہے۔ اور ان کا ذہن انسانی زندگی کے سارے مسائل میں دل کے ساتھ دھڑکتا معلوم ہوتا ہے۔

شام سلگاتی چلی آئی ہے یادوں کے چراغ

کوئی جام آیا تو کیا کوئی گھٹا چھائی تو کیا

ابھی نہ رات کے گیسو کھلے نہ دل مہکا

کہو نسیم سحر سے ٹھہر ٹھہر کے چلے

آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آتو رہی ہے
آغوش سحر میں کوئی شرماتو رہا ہے

اب کسے ہے دماغ ہمت عشق
کون سنتا ہے بات پھولوں کی

دیپ جلتے ہیں دلوں میں کہ چتا جلتی ہے

اب کے دیوالی میں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز آتی رہی رات بھر

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں

موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

کوئی غم اور گراں اور گراں اور گراں

نغم زدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

نہ کسی آہ کی آواز نہ زنجیر کا شور
آج کیا ہو گیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے

سانس رکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
کوئی لیتا ہے ترا نام وفا آخر شب

سب وسوسے ہیں گرد رہ کارواں کے ساتھ

آگے ہے شعلوں کا دھواں دیکھتے چلیں

وا ہو رہی ہے میکدۂ نیم شب کی آنکھ

انگڑائی لے رہا ہے جہاں دیکھتے چلیں

قریب آؤ ذرا اور بھی قریب آؤ   کہ روح کا سفر مختصر غنیمت ہے

ملے تو بچھڑے ہوئے میکدے کے در پہ ملے

نہ آج چاند ہی ڈوبے نہ آج رات ڈھلے

ہم اپنے اک دل بے خطا کے ساتھ آئیں

تم اپنے محشر دار و رسن کے ساتھ آؤ

آج تو تلخی دوراں بھی بہت ہلکی ہے   گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی زندگی رنگ گل کا بیاں دوستو

گاہ روتی ہوئی گاہ ہنستی ہوئی میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو

کیسے طے ہو گی یہ منزل غم کس طرح سے ہو دل کی کہانی رقم

اک ہتھیلی میں دل اک ہتھیلی میں جاں اب کہاں کا یہ سود و زیاں

دوستو۔

ان سب اشعار میں لہجے کی کھنک اور انفرادیت نمایاں ہے طرز بیاں جدت لیے ہوئے ہے اور الفاظ کی تازہ کاری نے بہت سے گل کھلائے ہیں لیکن آخری دور کی شاعری میں وہ اپنے عقاید و نظریات کے گرد ایک ہالہ بنا کر سوالیہ نشان بناتے ہیں مارکسزم کو نظام حیات جان کر بھی زندگی کے اس رخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو جہد زندگی کے میدان میں اتنی عملی سرگرمیوں کے باوجود تشنہ رہا۔ مخدوم اپنے لہجے کی کھنک طرز بیان کی ندرت اور شعری اظہارات کے وسیلوں میں تمام ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں بہت آگے ہیں ان کی شاعری جدید شاعری کے لباس اور روح دونوں سے قریب تر

ہے۔ انہوں نے تخلیقی سطح پر ایسے سوالوں کو اٹھایا ہے جن کو چھوتے ہوئے اور جن کا اشارہ دیتے ہوئے بھی ان کے معاصرین ڈرتے تھے اور یہی انکے ذہن کی توانائی اور احساس کی صداقت کا واضح ثبوت ہے۔

مخدوم نمائندہ ترین ان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے احساس اور جذبے کی شاعری کر کے مسرت اور بصیرت کا سامان فراہم کیا ہے ترقی پسند تحریک سے پیدا شدہ شاعری کے نمونوں اور نمائندہ غزلوں اور نظموں میں سب سے سچے کھرے اور حقیقی نمونے اور اشعار مخدوم ہی کے ہیں ان کا کلام چاہے دنیا کے عظیم شاعروں کے کلام سے ٹکر نہ لے سکے لیکن اپنے عہد کا اچھا سچا اور فطری کلام ہے اور اپنے تمام معاصرین سے بلند اور عظیم تر اپنے زمانے اور وقت کی یہ معتبر آواز ادبی معیاروں کی کسوٹی پر پوری بھی اترتی ہے اور اس میں زندہ رہنے کے سارے امکانات بھی موجود ہیں۔

اختر الایمان بحیثیت شاعر

اردو شاعری اپنے گزشتہ ۴۰ سالوں میں کوئی ایسا عظیم شاعر نہ پیدا کر سکی جسے غالب اور اقبال کی صف میں رکھ کر فخر سے سربلند کیا جا سکتا۔ ۱۹۳۷ء کے بعد صنف نظم میں نئے نئے میلانات کا اضافہ ہونا شروع ہوا مختلف شعری تجربوں نے مواد۔ طرز فکر اسلوب اور اظہار پر بھی اثرات مرتب کئے۔ اپنی نمو پذیر شاعری اور بالیدگیٔ فکر سے چند شعراء نے کچھ اہمیت بھی حاصل کی۔ ان میں سے بیشتر شاعروں کی آواز جس سے نوجوانوں کی مضطرب منتشر اور بے قرار روح کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب اپنی آب و تاب اور ظاہری چمک دمک کھو چکی ہے توانائی کے فقدان کی وجہ سے نہ صرف ریگ دور کی آواز معلوم ہوتی ہے بلکہ اپنے تمام امکانات ہی ختم کر چکی ہے۔ ماضی قریب کے ایسے چند اہم شاعروں میں سے جن کی تخلیقات میں اپنے زمانے کی

مخصوص حقائق کے ساتھ شعری رویہ اور فنی طریق کار کی جلوہ گری ہے ایک اخترالایمان بھی ہے جس کی شاعری جو وقتی طور پر ہنگامی موضوعات کی گھن گرج میں دب سی گئی تھی اب پھلنے پھولنے کے لئے زیادہ سازگار فضا میسر آئی ہے اور جس سے استفادہ کر کے نئی نسل اپنی راہوں کو متعین کرنے میں لگی ہوئی ہے ان کے یہاں مستقبل کا اشاریہ اور وہ نئی راہیں ہیں جن پر چل کر نئی نسل کچھ اور زیادہ روشن چراغ جلا سکتی ہے چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ ان کے چراغ کی لو کو تیز کر کے اور ان کے تجربوں کو سنگ میل مان کر شعر و ادب میں کچھ جاندار اور صحت مند اضافے بھی ہو سکتے ہیں۔

اخترالایمان کی شاعری کا محرک وہ فوری ردعمل نہیں ہے جو اعصاب زدگی۔ سستی جنست نام نہاد انقلابی گرج اور ہیجانی کیفیت سے پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ تجربوں کی بنیاد پر لکھا ہے۔ یہ کرب اور شدت درد کی انتہا پر پہونچ کر جو کچھ محسوس کرتے ہیں اسے اظہار ذات کے ملفوظے میں لپیٹ کر لفظی تصویروں اور فطری امیجری کی مدد سے فنی دروبست کے ساتھ پیش کر دیئے ہیں ان کی کھردری۔ تشکیک پر مبنی اور انتشاری شاعری بھی انسانی خلوص اور جذبے کے تابع ہے۔ انہوں نے معاشرے اور زمانے کے گرم و سرد سے واسطہ رکھا ہے سیاسی حالات۔ تاریخ اور انسانی نفسیات پر ان کی نظر گہری ہے انہوں نے ادب میں شعری تجربے بھی کئے ہیں زبان میں قابل قدر اضافے بھی کئے ہیں نئے تصورات اور میلانات کی ترویج کر کے نئے شعور کی ترجمانی اور نمائندگی بھی کی ہے۔ اختر کی نظموں کے پیچھے جو ذہن کام

کر رہا ہے اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد ملک کو انتشار کے دہانے پر کھڑا دیکھا تھا اور ہر طرف بدمزاجی کیفیت میں مبتلا پایا تھا زندگی گراں بار اور صنعتی شہروں کی زد میں آچکی تھی ذات اور سماجی زندگی کے درمیان بُعد پیدا ہو گیا تھا۔ جدید علم و تہذیب اور صنعتی انقلاب نے زندگی کے سارے لوازمات اور ساری قدروں کو بدل دینے کی ٹھان لی تھی معاشرہ نیلام گھر بن گیا تھا۔ کمزور حکومت سیاسی ابتری۔ مجہول اور ناقص تصور حیات۔ ماضی کا احیاء جدید تعلیم سائنس اور ٹیکنولوجی کی روزافزوں ترقی۔ بے عملی اور تنظیمی صلاحیت سے محرومی نے ان کی فکر کو جھنجھوڑا ہے اور پھر انہوں نے اپنی شعری فکری زبان کو جاگیردارانہ سماج کی زبان سے نکال کر ذاتی اور سماجی تصورات۔ خیالات اور احساسات کا اظہار اپنے منفرد طریقے سے کیا ہے اور اسی لئے ان کے یہاں رومانی انداز کی شاعری کے بجائے زبان و بیان میں سنجیدگی نظر آتی ہے انہوں نے اپنے بالغ شعور کی انفرادیت سے کام لے کر اسلوب و موضوع کا صحیح انتخاب کیا ہے اور اس میں ایک ایسا نیا پن اور جدت پیدا کی ہے کہ ہر اچھی شاعری کی طرح ان کی شاعری کو کبھی کبھی پڑھنے کو جی چاہتا ہے اختر الایمان نے شعر کے مبہم اور گنجلک پردے میں چھپ کر اپنے غیر صحت مند خیالات کی دھند پھیلانے کے بجائے جدید انسان کے ذہن کی الجھنیں اور گتھیاں سلجھانے کی کوشش کر کے ادب اور انسانیت دونوں کی خدمت کی ہے۔

سماجی زبوں حالی۔ صنعتی ترقی۔ شہروں کی ہماہمی۔ سائنس کی ارتقا اور حاکمانہ اقتدار کے سامنے فرد کی بے بسی اور پسپائی نے انہیں انتشار طبع اور احساس

پشیمانی سے بچایا ہے علم اور مشاہدے کی مدد سے تنہائی کا طلسم بار بار ٹوٹتا ہے اسی لئے شعری فکر پر قنوطیت کا لبادہ چڑھتے چڑھتے رہ گیا ہے۔ قنوطیت سے بچا کر انکی شاعری فکر نے ہندوستانی معاشرہ میں نا آسودگی کا ذہنی بدل سوچا ہے۔ اور سماجی احساس کا ساتھ بھی دیا ہے ذہنی سفر کی فطری رفتار میں اندھیرے اور روشنی کی کشمکش بھی آتی ہے زندگی اور موت کا تصادم بھی ہوتا ہے ویرانی اور آبادی کے ٹکراؤ سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن بے دلی کے انتہائی پر آشوب ہونے کے باوجود شکست نارسائی اور نا امیدی جاوید کو انہوں نے اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ برخلاف اس کے روشن زندگی اور اسکے متنوع پہلوؤں کو اپنا کر تنہائی کے اس جان لیوا احساس کو خارجی حالات کے تابع کر لیا اور شاعری کی بساط الٹ دی اور اپنا ایک علٰحدہ مقام بنالیا۔

"گرداب" "تاریک سیارہ۔ یادیں اور بنت لمحات کو میزان بنا کر اخترالایمان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے زندگی کو ایک اکائی کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ جبکہ ان کے عصر کے دوسرے شعراء نے زندگی کو خانوں میں تقسیم کر کے اور روحانیت کو اپنے اپنے مزاجوں پر مسلط کر کے شاعری کو بھی خانوں میں بانٹا اور شاعری میں اس یگانگی اور مصنوعی تقسیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاعر نے زندگی کی جزوی حقیقت ہی کو پیش کرنے پر قناعت کی۔ اور شاعری کو سیاسی جنسی انقلابی اور ترقی پسندی کے نام دے کر عظیم شاعری کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ اختر کا زمانہ تحریکوں کے عروج کا زمانہ تھا کسی نہ کسی تحریک سے وابستگی لازمی سمجھی جاتی تھی

ترقی پسندی۔ غیر ترقی پسندی۔ فراریت رجعت پسندی۔ جنسیات اور جدیدیت اور کلاسکیت میں سے کسی کو ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دینا لازمی ٹھہر گیا تھا۔ لیکن اختر اس سٹہ بازی سے محفوظ ہیں ان پر اس قبیل کا کوئی لیبل نہیں لگایا جا سکتا ان کے یہاں تو زندگی کے متنوع اور پیچیدہ مسائل بھی ہیں اور ان کا واضح حل بھی۔ خارجی زندگی کا ادراک بھی ہے اور سیاسی اور اجتماعی محرکات بھی ہیں شعری روایات سے استفادہ بھی کیا گیا ہے نئے اسالیب واظہار کی تلاش وجستجو بھی ہے نئی طرز فکر۔ موضوع اور ہیئت کے بہت زیادہ چونکا دینے والے غیر مانوس اور اجنبی تجربوں سے اپنے کو بچایا ہے ان کے یہاں تو اظہار و بیان کے ایسے اہم تجربے ہیں جن میں موضوع کی ہم آہنگی برقرار رہتی ہے اجنبیت اور نامانوسیت کا احساس قطعی نہیں ہوتا رجحانوں کے اس دور میں کسی رجحان کے ناوابستگی اور ہیجانی مزاج نہ اپنانے کی وجہ سے اختر اپنے ہم عصروں میں مقبولیت حاصل نہ کر سکے ان کا تہہ دار اور سنجیدہ مزاج اس سستی ہیجانیت کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

۱۹۴۴ء میں گرداب کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا چڑھتی جوانی کی اس منزل میں بھی فلسفیانہ جستجو اور بہت سے بنیادی حقائق جیسے فنا اور بقا کا مسئلہ مٹتی ہوئی تہذیب کی پرچھائیاں۔ وقت اور اس کی ناگزیری خیر وشر کی معرکہ آرائی ظاہر و باطن کی کشمکش خواب اور حقیقت کی پیکار یاس اور امید کی رزم آرائی کی جھلکیاں صاف پتہ دیتی ہیں کہ اس شعری مزاج وفکر میں زمانے اور ماحول کی وہ زندہ روح ہے جس کو نظروں سے دیکھ کر تجربے سے

برت کر اس تضاد کو محسوس کر لیا گیا تھا۔ جو اس سارے المیہ کی بنیاد ہے۔ گرداب کی نظموں میں جو ڈرامائی کیفیت ہے وہ اردو نظم کے لئے نئی چیز تھی اور اس میں ناپید بھی تھی اردو شاعری اس لہجے اور اس آہنگ کے لئے ترستی تھی۔

مسجد۔ پرانی فصیل۔ تنہائی میں۔ موت جاری اور پگڈنڈی میں مناظر کردار اور علامتوں کی معنویت نے لامحدود فضاؤں کا احاطہ کیا ہے۔ مسجد ان اقدار کا وسیع استعارہ ہے جو مذہب کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے ندی وقت کی علامت ہے ندی کا پس منظر توانا۔ جاندار اور وسعت لئے ہوئے ہے وقت اختر کے یہاں شروع سے آخیر تک یعنی گرداب سے بنت لمحات تک چھایا ہوا ہے۔ وقت بازآید میں رعنائی قصائی کا وقت کی کہانی میں گرداب زیست کا۔ پندار میں خدا کا اور کوزہ گر میں ساحری کا روپ دھارے ہوئے ہے ندی میں یہ نقش گر حادثات ہے جو ہر غیر ضروری چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا کرے جاتا ہے اور فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

گرد آلود چراغوں کو ہوا کے جھونکے
روز مٹی کی نئی تہہ میں دبا جاتے ہیں
اور جاتے ہوئے سورج کے وداعی انفاس
روشنی آ کے دریچوں کی بجھا جاتے ہیں
چاند پھیکی سی ہنسی ہنس کے گزر جاتا ہے
ڈال دیتے ہیں ستارے دھلی چادر اپنی

اس نگارِ دلِ یزداں کے جنازے پہ بس اک
چشم نم کرتی ہے شبنم یہاں اکثر اپنی
اک میلا سا اکیلا سا فسردہ سا دیا
روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے
تم جلاتے ہو کبھی آ کے بجھایا بھی کرو
ایک جلتا ہے مگر اک بجھا کرتا ہے

یہ بے جان اور رعشہ زدہ ہاتھ ان قوتوں کے نمائندہ ہیں جو اب بھی مٹی ہوئی تہذیب کی اقدار کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتے ہیں وقت کی ناگزیری کو محسوس کر کے شاعر آگاہی دیتا ہے کہ وقت کا بہتا ہوا دھارا اس سب کو بہالے جائے گا اگر بدل سکتے ہو تو خود کو بدل ڈالو۔

تیز ندی کی ہر اک موج تلاطم بردوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
کل بہالوں گی تجھے توڑ کے ساحل کے قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی

پرانی فصیل اس بحرانی دور کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں انہوں نے آنکھیں کھول کر اپنے گرد وپیش کو دیکھا۔ پرانی تہذیب کا خاتمہ قریب ہے نئی تہذیب دسترس سے دور ہے انتشار و بحران چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ المناک مناظر اور کرب انگیز نظاروں نے پوری فضا کو اپنے چنگل میں جکڑ رکھا ہے اس نظم میں ایسی بہت سی حقیقتوں پر سے پردہ اٹھائے گئے ہیں جس کا تماشہ

آزادی کے بعد دیکھنے میں آیا تھا۔ وہاں سہمی ہوئی ٹھٹھری ہوئی راتوں نے دیکھے ہیں۔ دریدہ پیرہن عصمت نگوں سربال آوارہ گریباں چاک سینہ وا بدن لرزاں نظر تیرہ۔ خم ابرو میں درماندہ جوانی محو نظارہ کہتے روتے بھٹکتے پھر رہے ہیں ہر طرف ہر سو۔ غلاظت آشنا جھلسے ہوئے انسان کے پتلے یہ وہ ہیں جو نہ ہوتے تو کوکھ پھٹ جاتی مشیت کی۔ تمناؤں میں ان کی رات دن کھنچے گئے بچے۔ غرض ایک دور آتا ہے کبھی اک دور جاتا ہے مگر میں دور اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں۔ میرے تاریک پہلو میں بہت افعی خراماں ہیں نہ توشہ ہوں نہ راہی ہوں نہ منزل ہوں نہ جادہ ہوں۔

ایسے وقت میں جب انسانوں کی نسل دو تہذیبوں کے اندھیروں کے درمیان بھٹک رہی تھی اور ہر چہار طرف شکست تنہائی۔ یاس و حرماں موت حیات کی کشمکش سے پیدا کردہ پرچھائیاں تھیں۔ اختر ان سے نظر بچا کر بھلا کیسے نکل سکتے تھے لیکن اختر کی یہ شاعری نہ فراری ہے اور نہ جھوٹے خوابوں کا ہالہ بنا کر اس میں پناہ لیتی ہے بلکہ انسانی تہذیب کے اس کرب کو محسوس کرکے بغیر کسی نقاب کا سہارا لئے پیش کرتا ہی ان کا فن ہے۔

اک دھندلکا سا ہے دم توڑ چکا ہے سورج
شب کے دامن میں ہیں دھبے سے سیہ کاری کے
اور مغرب کی فنا گاہ میں پھیلا ہوا خوں
دبتا جاتا ہے سیاہی کی تہوں کے نیچے

اور پھر اس منظر کی تاب نہ لاکر ایک شدید ردعمل سے دوچار ہونا پڑتا ہے

اور شاعر پکار اٹھتا ہے۔

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں
ایسے انسانوں سے پتھر کے صنم اچھے ہیں
ان کے قدموں پہ چمکتا ہوا دمکتا ہوا خوں

تنہائی کے شدید احساس سے ابھرنے والی یہ نظم بھی بنیادی حقائق کی جستجو پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ یہاں تالاب اور اس میں سڑتا ہوا پانی انسانی سماج میں جمود اور تعطل کی نشان دہی کرتا ہے اور اس کے کنارے کھڑا ببول کا درخت تنہا فرد کی علامت بن کر ابھرتا ہے ببول کا درخت پانی بھرے تالاب کے کنارے رہ کر بھی سوکھا ہے خشک ہے اور فرد انسانی سماج کے ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی کو خشک۔ بے کیف اور بے برگ و بار محسوس کرتا ہے۔

ہاتھ پھیلائے ادھر دیکھ رہی ہے وہ ببول
سوچتی ہوگی کوئی مجھ سا ہے یہ بھی تنہا
آئینہ بن کے شب و روز تکا کرتا ہے
کیسا تالاب ہے جو اس کو ہرا کر نہ سکا

سماج میں انسان کا یہ احساس تنہائی اختر کو دل گرفتہ ضرور کرتا ہے لیکن وہ احساس ایک نئے معاشرے کی تخلیق کرانا چاہتا ہے اس میں شکست۔ اور پسپائی کا پہلو نہ نکالئے یہ متحرک۔ فعال اور صحت مند ہے اختر نے

اپنے شعور کی توانا قوت سے پرانی فصیل کو ٹوٹنے اور فسردہ نظام کو دم توڑتے ہوئے دیکھ لیا ہے یہ جانکنی انہیں زندگی کی طرف لوٹاتی ہے ان کی ڈرامائی نظم موت میں یہ جاں کنی نمایاں ہے جس کا بنیادی کردار دم توڑتا ہوا فسردہ پرانا از کار رفتہ سماج اور اس کا نظام ہے۔

زلزلہ اف یہ دھماکا یہ مسلسل دستک
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
اف یہ مغموم فضاؤں کا المناک سکوت — کون آیا ہے ذرا اک نظر تو دیکھ لو
توڑ ڈالے گا یہ کمبخت مکاں کی دیوار — اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا

یہ حیات و موت کی کشمکش ہے اور اب اس پرانے نظام کا انجام نظروں کے سامنے ہے تصادم و پیکار کا یہ پرجلال احساس گرداب کی تمام نظموں میں ابھرتا ہے اور یہی احساس ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز بھی کراتا ہے یہاں اختر ذات کے خول سے باہر نکل کر شخصیت کے وسیع کرنے میں لگ گئے ہیں۔ تجربات و مشاہدات نے کچھ ایسے حقائق کو دریافت کر لیا ہے جو پوری انسانی زندگی پر محیط و بسیط ہے اپنی فکری نظموں جواری اور پگڈنڈی میں جو سوالیہ نشانات اختر نے قائم کئے ہیں۔ ان میں زندگی کے لئے تڑپ کے ساتھ کچھ کر گزرنے کی آرزو بھی ہے۔

کیا جانے یہ بازی کس نے جیتی کس نے ہاری
کیا جانے کیوں سانجھ سویرے آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں
کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے
تاریکی آثار سحر ہے تاریکی انجام نہیں ہے

آنے والوں کی راہوں میں کوئی نور آشام نہیں ہے۔

احساسات اور تاثرات کے پس منظر میں ابھری ہوئی ان نظموں کا استفہامیہ انداز اختر کے مخصوص مزاج کی نمائندگی کرتا ہے:

وہ کون سا جہاں ہے ازل نہیں ابد نہیں

دراز سے دراز تر ہیں حلقہ ہائے روز و شب۔ پر کس مقام پر ہوں میں کہ بندشوں کی حد نہیں۔ نقش پا ایک دورا ہے پر حیراں ہیں کس سمت بڑھوں۔ اپنی زنجیر سے آزاد نہیں ہوں شاید

میں کبھی گردش گہہ ایام کا زندانی ہوں

درد ہی درد ہوں فریاد نہیں ہوں شاید

"محرومی"

سوچ میں ڈوب گئے رہ گزر کے خم و پیچ

کون اب آئے گا امید کے ویرانے میں فیصلہ

ٹوٹے پھوٹے جام پڑے ہیں سونی سونی ہے یہ محفل

دھوپ سی ڈھل کر بیت گئی ہے ساقی کی مجبور جوانی

کیا جانے کب سورج نکلے بستی جاگے غم سٹ جائیں

کوئی دروازے پہ دستک ہے نہ قدموں کے نشاں

"نئی صبح"

چند پر ہول سے اسرار تہ سایۂ در

خود ہی سرگوشیاں کرتے ہیں کوئی جیسے کہے

پھر پلٹ آئے یہ کمبخت وہی شام و سحر
"زندگی کے دوراہے پر"

کس قدر تیزی سے یہ باتیں پرانی ہو گئیں .... لغزش

یہ سب شدید تناؤ کی کیفیات ہیں یہاں داخلی اور خارجی حقائق کے ٹکراؤ سے کرب پیدا ہوا ہے گرہ پر گرہ لگتی ہے جستجو کو کسی منزل پر قرار نہیں ذہن چاروں طرف بھٹکتا ہے کسی ایسی راہ کی تلاش میں جہاں کچھ زندگی کی حرارت ہو لیکن کہاں ... اور یہ سلسلہ مسلسل ۸ سال تک یعنی تاریک سیارہ کی نظموں تک جاتا ہے اسی کشمکش اور تناؤ نے تاریک سیارہ اور خاک و خون جیسی ڈرامائی زندہ اور پائندہ نظمیں لکھوائی ہیں۔ موت کا کردار یہاں آتے آتے زیادہ واضح ہو گیا ہے خواب اور حقیقت کی رزم آرائی اور فرد کی پستی اور قوت نمو کا ٹکراؤ ان دونوں نظموں کا پس منظر ہے جس میں بقول اختر بہار آفریں مستقبل کی ایسی قوت نمو ہے جو نئی انسانیت اور آنے والی نسلی کے لئے تمہید بن سکتی ہے۔ استفہامیہ انداز اور جستجو تلاش کا عمل یہاں بھی پوری طرح جاری و ساری ہے جس کی کارفرمائی تاریک سیارہ کی نظموں میں ہے۔

میں سوچتا ہوں کہیں زندگی نہ بن جائے
خزاں بدوش بہار و خار زہر آلودہ

ریت کے محل کی آواز اور وہ ہے ایک سوال جس کا جواب نہیں مل رہا ہے۔

اسی لئے کیا اگا کریں گے ۔ یہ نرم پودے یہ نرم شاخیں ۔ کہ

ان کو ایک روز ہم اٹھا کر۔ خزاں کی آغوش میں سلا دیں۔
اور جب آنکھ کھلی تو تاروں کے سہارے چل رہے تھے سورج کی تلاش میں تھے راہی لیکن جب سورج کا سویرا نظر آتا ہے تو جنگ کی ہولناکی اور بربریت ہے اور پھر دہقاں سنوارتا ہے   چن چن کے بکھیرتا ہے دانے... اور سوچتا جا رہا ہے جی میں پھر آئے گی جنگ آزمانے اور یہ اندیشہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

سوچ لوں باز کروں ورنہ کروں   شیشہ و سنگ کی جھنکار سنوں
آج کیا کہتے ہیں غمخوار سنوں۔ لیکن ابھی ہر طرف وہی نراجی کیفیت ہے۔

اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا۔ اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا .... اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا اب یہ بازیک سیارہ کی آواز میں جان۔ اچھوتا پن اور نیا پن آچکا ہے طرز فکر، اسلوب اور لب و لہجے میں نئی فضا کروٹ لیتی معلوم ہوتی ہے ایک بالکل نئے آہنگ کی پرسوز اور توانا جھنکار سر کو جھٹکنے پر مجبور کرتی ہے اور دعوت فکر بھی دیتی ہے اب تناؤ، تصادم اور شدت کرب میں آسودگی، حلاوت اور جان سوز غنائیت و پرسوزی کا احساس جاگتا ہے جو دل کی دھڑکن بھی بڑھاتا ہے اور ایک نئے لہجے سے بھی روشناس کراتا ہے اور یہ تبدیلی اور رد عمل اس بات کا غماز ہے کہ یہاں تک آتے آتے اختر کو زندگی کا عرفان حاصل ہو چکا ہے اور وہ اس سارے نظام سے آگاہ ہو چکے ہیں جس نے انتشار اور تنہائی کے احساس کو جنم دیا ہے۔ اس آگہی نے

ان میں زیادہ توازن۔ نرمی۔ بردباری۔ لہجے میں رس۔ ٹھاس اور مانوسیت پیدا کر دی ہے۔ تخلیقی شخصیت کے اس ارتفاع نے اختر کی شعری فکر کو اپنے دور کی شاعری سے بہت بلند کر دیا ہے۔ اس سربلندی اور عظمت کی بازگشت ان کی تاریک سیارہ کی نظموں تبدیلی۔ انفاق۔ عہد وفا سرراہ گزارنے۔ اندوختہ۔ محبت۔ واپسی۔ یوں نہ کہو دور کی آواز۔ جان شیریں اور اعتماد میں سنی جاسکتی ہے۔ اور بنت لمحات کی نظمیں وقت کی کہانی۔ بے تعلقی۔ شیشے کا آدمی۔ زندگی کا دقفہ مفاہمت۔ رابطہ۔ سبزۂ بیگانہ۔ کل کی بات اور بنت لمحات جیسی نظمیں بھی اس امر کی شاہد ہیں کہ اب اختر کی شعری فکر کا دائرہ وسیع اور متنوع ہو گیا ہے یادیں ان کا کلیات ہے جس میں گرداب اور تاریک سیارہ کی نظموں کو یکجا کر دیا گیا ہے تاریک سیارہ کی نظموں کی تازگی۔ ندرت تہہ داری۔ علامت اسلوب گہرائی۔ سادگی اور بے ساختگی پڑھنے والوں کو اپنے بہت قریب کر لیتی ہے یہاں علامتی شاعری کی معنویت ہمہ گیری اور براہ راست شاعری کی وضاحت صفائی اور عمومی اپیل ہے جو اردو شاعری کے لئے بڑا قیمتی اور گراں مایہ سرمایہ ہے۔ اختر نے عصر حاضر کی اردو نظم کو نئے پیرایہ کی دریافت کی کئی سمتیں اور جہتیں دی ہیں جس سے شاعری کے امکانات میں بہت خوش گوار اضافہ ہوا ہے۔ اس کی آواز کو آگے بڑھا کر ان میلانات اور امکانات میں اور ترقی پذیری اور نمو پذیری آسکتی ہے۔

اختر الایمان نے میرا جی کے اسلوب کے کچھ عناصر کو اپنی شخصیت اور مزاج کے دوسرے عناصر سے آمیز کر کے ایک نئی اور منفرد شکل دی ہے اختر نے

یراں جی کے اسلوب و اظہار اور ان کے ذاتی میلان سے مثبت اور تخلیقی طور پر
استفادہ کیا ہے اپنے گیتوں اور نظموں کے لئے زبان انہیں سے لی ہے۔ اختر
نے لاشعور اور تحت الشعور کی گتھیوں کو تخلیقی اور شعری پیکر دے کر اس طرح
سلجھایا ہے کہ وہ ان کے وجدان کا جز معلوم ہوتے ہیں۔ نقطہ مزاج اور
خاتمے کا احساس ہوتا ہے۔ ذہن کی پرچھائیوں میں تخلیقی کرب کہیں کہیں کروٹیں
لیتا معلوم ہوتا ہے۔ نام نہاد جدید اور ترقی پسند شاعروں کے نا تمام اور ناتراشیدہ
تجربوں کے دھندلکوں سے بچا کر اختر نے اپنی شاعری کو نئی معنویت سے اجاگر
کرنے کی بلیغ اور کامیاب کوشش کی ہے۔ اجنبی۔ بلاوا۔ اجل ترغیب
اور اس کے بعد جیسی نظموں میں میراجی کی چھاپ نظر آرہی ہے اختر کی اپنی آواز
اور انفرادی طرز تاریک سیارہ کی وہ مکان۔ انتظار۔ ترک وفا ایک لڑکا
اگلی یادیں۔ میرا نام۔ نیا شہر۔ ماضی۔ عمر گریزاں کے نام کتبہ اور مسافت
جیسی نظموں میں صاف نمایاں ہے ان سب میں ان کی شخصیت اور شعری
مزاج انفرادی کردار بن کر سامنے آتا ہے اور اظہار تکنیک اور فنی طریق کار
کے کئی گوشے وا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں یہاں زبان کردار کا روپ دھار
لیتی ہے اور سادہ اور عام بول چال کی زبان ہے منظر اور ذہنی تصویر
بالکل سامنے کی ہے یہاں علامتی معنویت اور وقت کی رو تہہ داری اور
گہرائی کے ساتھ تاثر بھی چھوڑتی ہے اور بہت سے ان حقائق سے روشناس
کراتی ہے جو ہماری ذہنی مسرت اور بصیرت میں اضافے بھی کرتے ہیں اور
شاعری کو ایک نیا رخ بھی دیتے ہیں نظم تبدیلی صنعتی تہذیب میں ایک فرد کے

احساس تنہائی کو ظاہر کرتی ہے جو یقیناً ایک حیرت انگیز دریافت ہے اور شاعری میں ایسا اضافہ ہے جس کا بدل اردو شاعری میں نہیں ملتا۔

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں جو مجھے راہ چلتے کو پہچان لے

اور آواز دے او بے او سر پھرے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر وہیں

گرد و پیش اور ماحول کو بھول کر۔ گالیاں دیں۔ ہنسیں۔ ہاتھا پائی کریں پاس کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر۔ گھنٹوں ایک دوسرے کی سنیں اور کہیں۔ اور اس نیک روحوں کے بازار میں یہ میری قیمتی بے بہا زندگی۔ ایک دن کے لیے اپنا رخ موڑ لے۔ نظم عہد و فا معنی و مفہوم کی ان گنت تہیں رکھتی ہے۔ نثری آہنگ کو شعری ڈھانچے میں مبدل کر کے یہ بیان کی گئی ایک سادہ اور عام فہم کہانی ہے جس کے مصرعوں کی ساخت اور فقروں کی ترتیب میں بلا کی بے ساختگی اور برجستگی ہے۔ ٹکنیک اسلوب اور فنی طریق کار کے اعتبار سے یہ نظم کامیاب تجربہ اور جدید نظم کی روایت میں اجتہاد کا درجہ رکھتی ہے۔

یہی شاخ نم جس کے نیچے کسی کے لیے چشم نم ہو۔ یہاں اب سے کچھ سال پہلے مجھے ایک چھوٹی سی بچی ملی تھی جسے میں نے آغوش میں لے کے پوچھا تھا بیٹی۔ یہاں کیوں کھڑی رو رہی ہو۔ مجھے اپنے بوسیدہ آنچل میں پھولوں کے گہنے دکھا کر۔ وہ کہنے لگی میرا ساتھی ادھر اس نے انگلی اٹھا کر بتایا ادھر اس طرف ہی۔ جدھر اونچے محلوں کے گنبد ملوں کی سیہ چمنیاں آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑی ہیں۔

یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں سونے چاندی کے گہنے ترے واسطے لینے جاتا ہوں
رامی .....

اختر کی مختصر نظمیں ان کی طویل نظموں کے مقابلے میں بے ساختہ پن اور فطری پن لئے ہوئے ہیں۔ یہ سادگی۔ پرکاری اور سہل ممتنع کی کامیاب مثالیں ہیں یہاں سوادا اور پیرایہ بیان ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں اور پوری نظم ایک اکائی کی صورت میں اپنا بھرپور تاثر چھوڑتی ہے۔ الفاظ تراکیب۔ تشبیہات اور استعارات اور تمام ذہنی اور فکری تصویریں ایک کل بنانے میں مددگار ہیں۔ اختر نے نظم میں وحدت اور فنی خوبیاں پیدا کرنے کے لیے بہت ریاض کیا ہے اور اسی لئے ان کی نظم تکرار خیال سے ہٹ کر ایک معیار قائم کرتی ہے داخلی کیفیات اور خارجی مشاہدات تجربات میں اثر و تاثیر اور آہنگ یکساں ہے۔ نظم کے سارے اجزا پر ان کو قدرت ہے الفاظ کے استعمال اور مختلف ٹکڑوں کی مناسب ترتیب سے وہ کماحقہ واقف ہیں انہوں نے داخلی محسوسات کو شعری وجدان اور تخلیقی شخصیت کا جز بنا کر نفیس لباس عطا کیا ہے اور سماجی معنویت پیدا کرنے میں تعاون دیا ہے۔ ذاتی تجربات اور مشاہدات کو خارجی زندگی کے پس منظر میں دیکھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عمومی احساسات اور ارتعاشات کی کامیاب مصوری ہو گئی۔ ان شعری تصویروں میں کامیاب امیجری ہے اور شاعری سچائی اور خلوص کی جلوہ گری ہو گئی ہے۔ اختر نے اگر اپنے عصری شعراء سے تاثر قبول کر کے علامتی انداز اپنانے کے بجائے صحافتی انداز اپنایا ہوتا تو نظموں کی

بلاغت اور تاثر میں وہ دیرپا اور ہمیشہ قائم رہنے والی کیفیت اور اہمیت ختم ہو جاتی جس کی آج بہت ضرورت ہے۔ ربعیرت انہیں سماجی زندگی کو ادراک کا جز بنانے سے حاصل ہوتی ہے۔ موضوع اور پس منظر اختر نے ایسا منتخب کیا ہے کہ ہر قاری کو اپنے مزاج۔ شعری ذوق اور مذاق کے مطابق جمالیاتی مسرت نازک احساسات کی بازآفرینی دل کی آواز۔ رمزیت اور بلاغت مل جاتی ہے۔ اختر کامیابی کے ساتھ اپنے عہد کی ہمہ گیر حقیقتوں اور صداقتوں کا احاطہ کرنے میں کامیابی حاصل کر سکے ہیں۔

نظم ایک لڑکا میں انسانی ضمیر اس دور کے انسان کی علامت ہے جو ایسی ہے کہ ہر شخص اس لڑکے کو شخصیت کے اندر سے ابھرتا ہوا محسوس کرتا ہے

مجھے ایک لڑکا جیسے تند چشموں کا رواں پانی۔ نظر آتا ہے یوں لگتا ہے جیسے یہ بلائے جاں۔ مرا ہمزاد ہے ہر گام پر ہر موڑ پر جولاں اسے ہمراہ پاتا ہوں یہ سایہ کی طرح میرا تعاقب کر رہا ہے جیسے میں مفرور ملزم ہوں اور یہی لڑکا یا دیں کا کردار ہے جو اس دور کے ہر انسان کی کہانی لگتا ہے یہ بالک ہے آج بھی حیراں میلہ جوں کا توں ہے لگا۔ حیراں ہے بازار میں چپ چپ۔ کیا کیا بکتا ہے سودا۔ کہیں شرافت کہیں نجابت۔ کہیں محبت کہیں دفا۔ آل اولاد کہیں بکتی ہے کہیں بزرگ اور کہیں خدا ہم اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا۔ اور نکالی راہ سفر کی اس

آباد خرابے میں۔ دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں۔ لیکن اس احمق کا یہ تذبذب بیجا کرتا ہے لاکھ لاکھ سفر کی راہ نکالی جائے کتنی ہی نظر چرائی جائے لیکن اس آباد خرابے ہی میں پھر بھی زندگی تو کرنا ہی ہے۔ ان نظم میں لہجے کی حلاوت کشادگی۔ اور مانوسیت اس بھرپور اعتماد اور یقین سے پیدا ہوئی ہے جو انہیں انسان اور انسانیت پر ہے چونکہ اختر کو زندگی کا عرفان حاصل ہو گیا ہے اس لئے انہیں حزن و یاس، تشکیک اور احساس نارسائی کی چادر میں لپیٹنے اور اپنے کو غلاف میں ملفوف کرنے کی بجائے زندگی کو جوں کا توں قبول کرنے اور اس کے اونچ نیچ۔ گرم و سرد کو گوارا بنانے اور اس کے زہر کو ہضم کر کے امرت بنانے کا گر آگیا ہے اب دل دھرتی کے پیار سے معمور ہے۔ اب انسان دوستی اور انسان پرستی کا عقیدہ رنگ لاتا ہے اور اس سے کام لے کر زندگی کی اعلیٰ و ارفع اقدار کو بڑھاوا دیتے ہیں مدد لی جاتی ہے۔ یہ دوسروں کی طرح ان کی اپنی زندگی کا بھی مسئلہ ہے جس کا حل تلاش کرنے کی کوشش میں انہوں نے اپنے مشاہدے سے کام لیا ہے۔ انہوں نے انسان کو اور زندگی اور اس کی گوناگوں جہتوں اور سمتوں کو دیکھا پرکھا اور برتا ہے عام آدمی کی طرح صعوبتوں کو جھیلا ہے زندگی کی کڑی دھوپ میں اپنے کو پگھلتا ہوا محسوس کیا ہے دکھ درد کو جھیلا ہے زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے اور پھر اپنے طور پر اپنے مشاہدے اور تجربے کو بنیاد بنا کر انہوں نے زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں کو دریافت کیا ہے اور اس کا اظہار شعری رویہ کے ساتھ اس

طور پر کیا ہے کہ وہ کھری اور سچی شاعری کے معیاروں پر پورا اترتا ہے اور اسی کھری اور سچی شاعری کے سہارے وہ آج بھی سر اٹھا کر چل سکتے ہیں اور کل بھی شعر و ادب کی دنیا میں ان کا مناسب مقام بنا رہے گا۔

برے بھلے بھی سب لوگ اپنی دنیا میں
نقیبِ صبحِ بہاراں انہیں کی خیر منائیں
انہیں کو ساتھ لیے ان کے ساتھ بڑھتے جائیں
انہیں سے رونق بزم جہاں کا امکاں ہے

اختر کے ذہن میں زندگی اور اس کی پرچھائیاں آپس میں گڈمڈ نہیں ہوئی ہیں ساری تصویریں واضح اور نمایاں ہیں اور انہیں کی صحیح عکاسی ہے وہ ذہنی طور پر کہیں بھی الجھتے نہیں معلوم ہوئے۔ اور نہ ان کو پڑھنا صبر آزما کام ہے۔ انہوں نے اردو نظم کو غزلیہ رنگ اور عجمی انداز سے بچا کر ہندوستانی مزاج دینے کی کوشش کی ہے اور نظم کی صحیح تعریف کو قائم کرنے کی کوشش بھی کی ہے ان کی نظموں میں وہ فضا ہے جس میں ہمیں اپنی زمین کی قربت کا احساس ہوتا ہے اختر کے جلائے ہوئے چراغوں سے بہت سے چراغ جل سکتے ہیں انہوں نے اپنی شاعری سے انسانیت کے کاز کو فروغ دینے کی بلیغ سعی کی ہے اور اسی لئے یہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

دورِ جدید میں تاباںؔ کی غزل گوئی

موجودہ صدی میں شعری زبان نے بنیادی تصورات اور جدید رجحانات میں تبدیلی اور وسعت کے لئے اپنی آغوش کو بڑی حد تک وا کیا ہے اردو زبان میں اب اظہارات اور خیالات کی ترویج و اشاعت کے لئے تنگیٔ داماں کا شکوہ عبث ہے۔ دوسری عالمی زبانوں کی طرح اب اردو زبان میں بھی تشکیلی امکانات کی حدود میں تنوع کے ساتھ وسعت آئی ہے یہ تخلیقی زبان ہے اور ہر تخلیقی علمی اور ادبی زبان کی طرح اردو زبان میں بھی مسلسل وسعت تغیر تنوع اور اضافوں کا عمل جاری ہے اور رہے گا۔ رطافت ور زبان ہے۔

اردو غزل اپنی پہچان۔ زندگی۔ توانائی اور جانداری کے لئے لفظوں کے تنگ حصار اور محدود سیاق و سباق سے نکل کر زندگی اور اس کی سچائیوں سے قریب سے قریب تر آگئی ہے لفظ و معنی کی اہمیت اور ہمہ گیریت کو سمجھ کر

غزل کی روایت میں تصرف بھی کیا گیا ہے۔ کلاسکیت سے زبان و بیان کے سانچے ہے کر کچھ ایسے تجربات کئے گئے ہیں جو کامیاب ہیں نئی غزل نے عروضی تجربے بھی گوارا کر کے اپنے اندر سمو لئے ہیں علامتی اور رمزیہ پیرایہ بیان کے لئے بھی جگہ بنالی ہے۔ اور ہیئت اور مواد کی وحدت کو قبول کر کے فکر اور توانا وصحت مند اقدار کو بھی اپنایا ہے لیکن غزل میں تجربے وہی کامیاب ہوئے ہیں جو روایت کے اندر رہ کر کئے گئے ہیں روایت سے پوری طرح بغاوت اسے راس نہیں آئی ہے۔ لیکن یہ تو ثابت ہو ہی گیا ہے کہ غزل کے داخلی نظام میں تبدیلی۔ تغیر۔ وسعت اور اسکانی حرکات قبول کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔

تاباں اردو شاعری اور خاص کر غزل کے انتہائی محتاط اور سلیقہ شعار غزل گو ہیں اور موجودہ دور کے غزل گویوں میں ممتاز اور منفرد مقام بنانے میں انہوں نے بڑا ریاض کیا ہے اور خون جگر صرف کیا ہے۔ غلام ربانی تاباں نے اپنے ۴۲ سالوں میں ترجمے بھی کئے ہیں۔ تالیف کا کام بھی انجام دیا ہے اور شعری تخلیقات میں ان کے کئی شعری مجموعے ہیں جو اردو شاعری کا بڑا قیمتی گراں مایہ اور قابل قدر سرمایہ ہے ان کی شعری اور تخلیقی فکر کا عرصہ ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۷۶ء تک کے ۲۶ سالوں پر محیط ہے ساز لرزاں نظموں کا مختصر مجموعہ ہے۔ جس میں ان کا مزاج پوری طرح نمایاں نہیں ہے۔ حدیث دل۔ ذوق سفر اور نوائے آوارہ خالص غزلیات کے مایہ ناز مجموعے ہیں جن میں غزل کی کج کلاہی۔ نرمی شائستگی اور غزلیہ مزاج کے امتزاج کے ساتھ

دل کی باتیں ہیں جن کو دل کی زبان میں سلیقے اور قرینے کے ساتھ کہہ دیا گیا ہے۔ داخلیت اور خارجیت بھی ہے۔ محبوب اور اس کی اداؤں کے بانکپن کے ساتھ عصر حاضر کا کرب بھی ہے۔ یہ محبوب جتنا علامتی ہے اتنا روایتی ہے اس کی شان میں کلاسکیت کی شانِ محبوبیت کے ساتھ جدیدیت ہے جس سے ہمیں قربت کا احساس ہوتا ہے۔ تاباں کی خلاقی اس میں مضمر ہے کہ انہوں نے بہت ہی دیانت داری کے ساتھ ذکر محبت۔ شورش زندگی کے بیان اور موجودہ دور کے عصری مسائل کو غزل میں اس طرح سمویا کہ غزل کا وقار مجروح نہیں ہوا بر خلاف تغزل کی پاکیزگی۔ اس کی آبرو اور رچاؤ میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے اور غزل کا وقار بہتر سے بہتر ہو گیا ہے۔

دل کی جانب رازدارانہ نظر ہونے لگی
زندگی دشوار سے دشوار تر ہونے لگی

مل گیا شاید اسیروں کو بہاروں کا پیام
پھر قفس میں گفتگوئے بال و پر ہونے لگی

اب نگاہِ شوق کی گستاخیوں کا ذکر کیا
بر ملا عرض تمنا در گذر ہونے لگی

جدید غزل کہنے والوں میں تاباں بہت ہی ستھرے ذوق کے معتبر شاعر ہیں جنہوں نے بڑی نفاست پاکیزگی اور چابک دستی کے ساتھ حسرت کے رنگ تغزل کو نکھار کر اس کی توسیع کی ہے۔ لیکن جذبے اور فکر کو یکجا کرنے میں فن غزل گوئی کی نزاکتوں کا ہر سطح پہ پاس و لحاظ کیا ہے

غزل کی پاکیزیت اور اس کے سارے لوازمات کو برقرار رکھتے ہوئے موجودہ دور کی حقیقتوں سچائیوں اور ناآسودگیوں کو غزل کے لہجے کو مجروح کئے بغیر اس کامیابی کے ساتھ پیش کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ یہ تاباں کا کارنامہ ہے کہ وہ اس پل صراط سے کامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں اور کامیاب ہیں ان کا اپنا ایک نظریہ حیات ہے جس کی وضاحت بھی انہوں نے غزل کی حدود ہی میں رہ کر کی ہے۔ رمز و ایما۔ ایجاز و اعجاز اور اشارات و علامات سے کام لے کر غزل کی زبان میں وہ باتیں کامیابی سے کہہ جانا جن کے لئے دوسروں کو یہ وادی تنگ اور محدود نظر آتی تھی۔ کمال فن کی جیتی جاگتی مثال نہیں تو کیا ہے؟ دستور زباں بندی کے باوجود سیکڑے وغیرہ کی اصطلاحوں میں تاباں بہت کچھ کہنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور یہی ان کی شناخت ہے ؎

سیکڑے کی اصطلاحوں میں بہت کچھ کہہ گئے
ورنہ اس محفل میں دستور زباں بندی بھی تھا

ترقی پسند تحریک ۱۹۵۰ء کے بعد دم توڑ چکی تھی۔ وہ بندشیں جو شاعروں اور ادیبوں کو پوری طرح جکڑے ہوئے تھیں۔ ختم ہو گئی تھیں جہاں سیاسی مسائل کا یا تو پرشور بیان تھا۔ ہنگامہ آرائی تھی۔ وقتی موضوعات تھے نام نہاد انقلابی نعرے تھے یا طے شدہ نقطہ نظر کے اظہار کی مجبوری تھی۔ ایسے وقت میں تاباں نے جذبے اور احساس کی صداقت پر زور دیا۔ کائنات اور ذات کی اہمیت کو محسوس کیا اور شعر میں خودشناسی کا مظاہرہ کیا۔

اک زمزمہ پرداز چمن اور نشیمن ۔۔۔ شعلہ کہیں زندانی خاشاک نہ ہو جائے

شعلہ کا زندانی خاشاک ہو جانا ترقی پسند تحریک کی ان ہی پابندیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس وقت شعر و ادب پر پوری طرح تسلط جمائے ہوئے تھیں۔ تاباں نے کلاسیکی اردو غزل کا گہرا مطالعہ کر کے صالح اقدار کو اپنایا۔ اور ان اثرات خیالات اور روایات کو قبول کیا جن سے غزل کو آگے بڑھانے مدد مل سکتی تھی۔ وہ غزل کو حسن و عشق کی واردات کے ساتھ ساتھ زندگی کا سوز و ساز اور عصری مسائل کی آگاہی بھی دینا چاہتے تھے اور یہ انہوں نے کیا بھی۔ زبان کے تشکیلی امکانات کو بروئے کار لا کر اور الفاظ کو معنی کی بنیاد بنا کر ان کے استعمال پر قدرت حاصل کی۔ تاباں لفظ کی اہمیت اور معنی کی افادیت سے بخوبی واقف ہیں۔

سوچتے کیا ہو جلاتے رہو زخموں کے چراغ
دیکھتے کیا ہو ابھی صبح کے آثار نہیں
زندگی درد کے سائے میں سکوں باقی ہے
ورنہ حالات تو وہ ہیں کہ جہنم بن جائے

تاباں اپنے مزاج افتاد طبع اور غزل کی طرف اپنے رجحان سے صحیح طور پر آگاہ تھے۔ غزل ہی ان کے مزاج سے میل کھاتی تھی اور اسی کو انہوں نے اپنا کر اس میں وسعت کے امکانات پیدا کیے۔ قدرت نے انہیں دیدہ وری اور خود شناسی کی صفات سے نوازا ہے۔ وہ خود کو پا گئے اور پھر پابندی پر آزادہ روی کو ترجیح دے کر فن کی لاج رکھ لی۔ فضول گوئی۔ یاوہ گوئی اور قافیہ پیمائی اور بے جان روات سے ہٹ کر انہوں نے جذبے کی تہہ داری اور

انداز بیان کی لطافت و نفاست پر بھی زور دیا اور غزل کو فکری خزانہ دے کر مالا مال کرنے کی بھی سعی بلیغ کی۔ جذبے کی شدت اور تغیرات کی ندرت سے غزل کی بلیغ معنویت کا دائرہ وسیع کرنے میں مدد دی۔ انہوں نے غزل پر لگے بہت سے بے بنیاد اور کسی حد تک صحیح الزامات کو رد کر کے وہ اشاریہ دیا جس پر چل کر موجودہ غزل اور غزلگو اپنے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر سکتے ہیں۔ تاباں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ غزل میں ہر نوع کے مضامین باندھنے کی پوری پوری قدرت ہے۔

تاباں کی غزل کے تاثر اور آہنگ میں کلاسیکی صیغۂ اظہار ہے لیکن خیالات اور فکر کا محور ہے اور عصر سے مطابقت رکھتا ہے۔ استعارات اور الفاظ کے استعمال میں توازن۔ تناسب اور احتیاط نے لہجے اور اظہار کی مخصوص سطح اپنائی ہے جس میں اجنبیت اور نامانوسیت کا احساس قطعی نہیں ہوتا رچے ہوئے ذوق اور پختہ کاری نے مانوس اور اچھوتا آہنگ تو ضرور عطا کیا ہے لیکن کہیں کہیں خیالات کی یکسانیت اور نظریات کی تکرار کھٹکتی ہے۔ بیشتر مقامات پر غزل کے آداب کو ناکام تجربوں اور ہنگامی موضوعات سے بچایا گیا ہے۔ اپنے زمانے کے مخصوص حالات کو گرفت میں لے کر غزل کے مانوس الفاظ۔ روایتوں اور استعاروں کے باطن میں نمایاں تبدیلی کی گئی ہے۔ اس خاموش تغیر اور بیرونی خدوخال کے باوجود غزل اپنے معین دائروں سے باہر نہیں جاتی۔ تاباں نے اپنے شعری مزاج کی تعمیر و تشکیل پر کافی وقت اور توجہ صرف کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تفکر آمیز لطیف طنز کے ساتھ

ساتھ رچی ہوئی سنجیدگی اور ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ وہی لے کے خزینہ اور خود کلامی لئے ہوئے اندازِ غزل کی حرمت کو قائم رکھا ہے اور سوچ اور فکر کا محور اور مجموعی تاثر اپنی سطح پر رہتا ہے۔

تمام دانش و حکمت کی انتہا معلوم
سوال الجھے ہوئے ہر جواب میں ہوں گے

راستوں میں بے طرح الجھے ہوئے ہیں راستے
منزلیں کیا ہیں قیاس آرائیاں کہہ لیجئے

رفتہ رفتہ کسی گم نام لہو کی تحریر
قاتلِ شہر کے دامن پہ ابھرتی جائے

وقت کے ہاتھوں ضمیرِ شہر بھی مارا گیا
رفتہ رفتہ موجِ خوں سر سے گزرتی جائے ہے

نوائے شوق میں دھڑکا کریں گے دل کی طرح
وہ تجربے جو رہِ انقلاب میں ہوں گے

ان اشعار کی کھنک غزل کے روایتی انداز سے نہ صرف یہ کہ مختلف ہے بلکہ اپنے اندر تفکر کی آنچ اور بھرپور تاثر رکھتی ہے جس سے نئے پن کے ساتھ ایک مسرت کا احساس ہوتا ہے جس کا اثر وقتی نہیں دیرپا ہوتا ہے۔

ان کے یہاں بھی بادہ و ساغر اور دشنہ و خنجر کہے بغیر بات نہیں بنتی لیکن یہاں ان علامتوں میں عصرِ جدید کی روح کی کارفرمائی ہے۔ یہ اس انتشار اور مزاجی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں جو روایتی انداز سے مختلف

ہیں۔ انہیں ماحول اور مسائل کا صحیح شعور اور واضح ادراک ہے اسی لئے
یہ غزل کے نازک ۔ شخصی اور محدود لہجے میں بھی شخصیت ۔ زندگی اور
اس کی گوناگوں کیفیات اور عصری مسائل کی عکاسی بڑی ہی چابک دستی
کے ساتھ کر پاتے ہیں اندرونی تحریک اور ذاتی اپج کو اساس بنا کر جو غزلیں
انہوں نے اپنے اردگرد کے ماحول کو پیش نظر رکھ کر کہی ہیں ۔ ان میں زندگی
کا سوز و ساز بھی ہے ۔ کلاسکیت کے گہرے مطالعے کی چھاپ بھی ہے اور
روح عصر کی جلوہ گری بھی ہے۔ غزل کو زمانے کا تیز شعور بخشا ہے ۔ اور شعری
فکر کو ایسی چاشنی دی ہے جس کی مثال خال خال ہے تاباں نے غزل کو
سہارا لیکر ماحول کے سارے انتشار کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور اسی لئے
اس میں خلوص کے ساتھ غنائیت آگئی ہے ۔ ان کی غزل میں جدت تازگی اور
توانائی کا احساس ہوتا ہے تاباں نے غزل سے فطرت کی نباضی اور معاشرے
کی نقادی کا کام بھی لیا ہے ۔ سماج کے سنگین سے سنگین مسائل کے بیان کی
بات ہو ۔ یا ظلم و استبداد کے مہیب دیوزاد کا سامنا ہو ۔ ماحول کی عصبیت
کی عکاسی کا ذکر ہو یا زمانے کی تنگ نظری اور چھوٹے فریبوں کا اظہار ہو
ہر جگہ انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز کو بلند رکھا ہے ۔ زمانے کے آگے نہ کبھی
سپر ڈالی ہے اور نہ کہیں دب کر سمجھوتا کیا ہے بلکہ سیاست شورش اور ہنگامی
حالات کو گرفت اور جکڑ میں لے کر زمانے اور ماحول پر ایمانداری اور دیانتداری
کے ساتھ نشتر زنی کی ہے موجودہ دور کے کرب و اندوہ کے بیان کے باوجود
ان کے یہاں عصری حسیت کی کمی ہے جو کچھ لوگوں کو کھٹکتی ہے ۔ لیکن اگر عصری

حسیت کی یہ کمی نہ ہوتی تو لہجہ درشت اور زبان کھردری ہو جاتی جس کی متحمل غزل نہ ہو سکتی تھی۔ اگر عصری حسیت کے بیان پر غزل کے فارم۔ زبان اور اسکی نازکی اور حسن کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا تو غزل مجروح ہو جاتی۔ اشاروں کنایوں اور ایجاز سے جو کام نکل سکتا ہے اس کے لئے بڑی قیمت چکانے کی کیا ضرورت ہے۔

تاباں کی زبان دھلی منجھی اور مترنم ہے جس میں حسن ادا کے ساتھ شعریت اور غنائیت ہے۔ کتابوں میں معنی خیزی اور خیالات کی فکر انگیزی نے غزل کے آبرو بڑھا دی ہے حیات وکائنات کے تصور کی جھلکیوں کے اظہار کے لئے جو لہجہ و آہنگ تاباں نے اختیار کیا ہے وہ قطعی مناسب۔ متوازن اور موزوں ہے۔ اکھڑے اکھڑے انداز بیان اور کھردری۔ غیر شائستہ اور غزل کے آداب سے ہٹی ہوئی زبان کو اگر وسیلہ بنایا جاتا تو غزل کے آداب کی خلاف ورزی ہوتی اور وہ تاباں کو لے ڈوبتی جدید انسانیت کی ذہنی پیچیدگیوں کا بیان جس طرح تاباں نے کیا ہے اس سے زیادہ اچھے اور لطیف انداز میں ابھی تک ممکن نہیں ہو پایا۔ غزل میں زندگی کا حسن اور اس کی نفاست ولطافت۔ توانائی۔ نیرنگیاں اور ان کے اظہار ترسیل و ابلاغ کا مخصوص اور منفرد انداز بیان تاباں کے صحت مند ذہن کی غمازی کرتا ہے غزل تاباں سے پہلے زندگی کی حرارت۔ صداقت کی چاشنی اور بیان کے حسن سے اس درجہ مالامال نہ تھی۔ ان کی غزل سے ذہن کو تسکین بھی ملتی ہے اور جذبے کو حرارت بھی اور پھر فکر اور احساس کا یہ امتزاج زندگی

کی کچھ بے رحم سچائیوں پر سے جب اپنے بلیغ طرزِ ادا سے نقاب اٹھاتا ہے تو اپنی شعری اور تخلیقی فکر کا بھرپور تاثر بھی چھوڑتا ہے۔

انہوں نے بڑی ذکاوت سے فکر و تخیل کو گرفت میں لیا خارجی حالات کو اپنی ذات میں جذب کر لیا اور پھر یقین۔ اعتماد اور کلاسیکی انداز کی شگفتگی کے ساتھ اس طرح بیان کیا کہ یہ سب جدید غزل کے معیار پر بھی پورا اترتا ہے اور روایت کی بزم پسند تو سیع بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں وہ توانائی بھی ہے کہ یہ آئندہ بھی غزل کے انداز و معیار کو فروغ پذیر رکھے گا۔

ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد تاباں عرفانِ ذات کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہیں جذبے اور احساس کی صداقت کی از سر نو آگہی ملی۔ شاعری میں صداقت کے ساتھ سچائی آئی۔ مسلسل سفر۔ تشنگی نارسائی۔ تلاش جستجو۔ ذوقِ حیات اور جہد و عمل کو غزل کا موضوع بنا کر انہوں نے غزل کے دائرے کو بسیط کیا اور سادگی اور خلوص کی آنچ دے کر اسکی معنویت کے دائرے کو وسیع کیا۔

کچھ سرابوں کی حقیقت ہے نہ خوابوں کی تلاش
خواہشوں کی انجمن آرائیاں کہہ لیجئے

آئینہ ٹوٹ گیا عکس بھی ٹوٹا ہوگا
کس نے سوچا تھا یہ انجام تمنا ہوگا

آج کی مجبوریاں معذوریاں اپنی جگہ
دل میں فردا کی حسیں تصویر بھی رکھتے ہیں ہم

ابھی جلیں گے یہاں اور بے رخی کے چراغ
اس انجمن میں وفا اور سرخ رو ہوگی

نسیم درد چلی زخم کھل کے پھول بنے
مہک اٹھا ہے مری زندگی کا ویرانہ

مسافروں سے بھی نازک ہیں راستوں کے مزاج
وہ پیچ و خم ہی سہی پیچ و تاب بھی سمجھو

جذبہ شوق کو اظہار کی فرصت نہ ملی
لفظ و معنی کا فسوں ٹوٹ گیا کیا کرتے

درد نارسائی کا لفظ ساتھ کیا دیتے
دل پہ جو گزرتی ہے اس کو تشنگی کہہ دو

ان اشعار کی طرح تاباں کے بیشتر اشعار میں غزل کا حسن۔ یقین کا نور تسکین کی روشنی اور زندگی کی سچائیوں کے ساتھ ایک واضح نظریہ حیات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ تاباں کی غزلوں کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ غزل اب غم حیات اور کائنات کی پنہائیوں کی ترجمانی بخوبی کر سکتی بشرطیکہ شاعر زباں پہ قدرت کاملہ رکھتا ہو بیان کے اسرار و رموز کا محرم راز ہو۔ دل میں خلوص و سچائی رکھتا ہو اور کسی دائرے میں اسیر نہ ہو اور تاباں میں یہ ساری خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

تاباں کی شاعری گہرے مفہوم تجربہ کی تازگی اور امکانات سے مملو ہے یہ خود تجربوں کی سنجیدگی اور احساس کے جان لیوا عذاب سے گزرے ہیں اسی لیے نہ ان کا محبوب رسمی ہے اور نہ ان کا فن۔ زمانے اور زندگی کے بارے میں ان کے احساسات میں خوش گواری ہے۔ یہاں کسی سچائی کو منوانے کے لئے صرف نقل روایت ہی کو کافی نہیں سمجھا گیا ہے نہ بے اعتمادی کی تلافی استدلال سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نہ اپنی ذاتی

کیفیات اور واردات ہی کو صداقت کا بدل سمجھا گیا ہے ان کے پاس زندگی کی واضح تصویر اور فن پر عبور ہے ۔ تاباں کی غزل کی دھار عوامی احساسات کے ذاتی اظہار سے پھوٹی ہے تاباں کے پاس حیات و کائنات کا کلی تصور ہے ان میں زندگی کے مسلسل اور پرترنم بہاؤ کو دیکھنے کی صلاحیت ہے ۔ آداب کی نقالی سے ہٹ کر زندگی سے تعلق پیدا کرنے کی بنا پر ان کے اشعار میں وہ نغمگی ہے جو دماغ میں دھوم مچا دیتی ہے یہ الفاظ سے خیال کا شکار کر کے اپنے ذہنی عمل کو مجروح نہیں کرتے بلکہ ان کے یہاں لفظی مناسبات انسانی اور سماجی رشتوں کا بدل ہیں ان کے اشعار پڑھ کر زندگی کا سلیقہ ایک مضبوط ارادے کے ساتھ بیدار ہو جاتا ہے وہ ذہنی نقوش جو ابتک مبہم تھے روشن ہو جاتے ہیں یعنی عام زندگی کی سچائی تاباں کی ذات سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے اور ذاتی عمل کی اس سچائی نے ان کے فن کو حسن اور زندگی بخشی ہے یہ بلند نصب العین سے سرشار چاروں طرف پھیلی ہوئی ناتمام لیکن آگے بڑھتی ہوئی زندگی سے متصادم ہوئے ہیں اور اسی لئے احساسات میں شدت اور تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں ۔

قرۃ العین حیدر اور ناول کا فن

اردو میں بڑے ناولوں کی تعداد کم ہے۔ مغربی ادب میں تو دوسرے درجے کے ناولوں کی بھی ایک روایت ہے۔ لیکن اردو دنیا کے پاس سکنڈ گریڈ کے ناول بھی خال خال ہیں۔ گھٹیا اور وقتی سنسنی اور سستی جذباتیت کو لمحاتی حظ دینے والے ناولوں کا انبار ہے جو ناول کی روایت کی تشکیل نہیں کرتے۔ ہمارے یہاں اردو ناول میں کہانی کی روایت مغربی ایشیا کی کہانی کی روایت کے مقابلے میں کمزور ہے یہ پوری طرح یا تو یورپ سے متاثر ہے یا اس کا عکس ہے۔ آج کے عہد میں فنکار کو ٹوٹتے ہوئے کلچر اور بدلتی ہوئی تہذیب اور زندگی کی ہر لحظہ تبدیل ہوتی ہوئی اقدار کا سامنا ہے۔ آج ٹکنیک اور ہیئت نئے ناول نگاروں کیلئے ایک مسئلہ ہے جس کا حل نئے لکھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کون سی

زبان اور کس طرح کا بیانیہ انداز اپنایا جائے۔ اس کو سمجھنے میں نئی نسل قاصر ہے۔

میرے بھی صنم خانے اور آگ کا دریا دونوں ناول اردو ادب میں معرکتہ آرا اور خاصے کی چیز ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا اردو ناول پر احسان عظیم ہے جس کو نظر انداز کبھی بھی نہیں کیا جا سکے گا۔ قرۃ العین حیدر سجاد حیدر یلدرم کی صاحبزادی ہیں ادبی ورثے اور تاریخی وادبی پس منظر کے بارے میں بس اتنا کہہ دینا ہی سارے اس ماضی کو سامنے لے آنا ہے جس سے یہ اپنی میراث کے طفیل فیضیاب ہوئی ہیں۔ لیکن فن کو فروغ دینے میں ان کے اپنے مشاہدے اور مطالعے کا بھی ہاتھ ہے۔ مسٹر اے جناب جیسے مخصوص خطابوں سے نوازنے والی یہ پڑھی لکھی اور سروقد خاتون اپنے الجھے الجھے بالوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ ان کے چہرے کی ساخت میں بڑی بڑی گمبھیر مسکراہٹ دبی رہتی ہے جب ان سے ذرا ادبی قسم کی بات کیجئے تو یہ اپنے الجھے ہوئے بالوں کے گرداب کو حرکت میں لاکر کچھ اس طرح کا جملہ داغیں گی۔ میں نے آپ کو پروفیسر رادھا کمل مکرجی کے باغ کے اس خنک قطع میں غالباً دیکھا ہے جہاں سیتل پائیاں بچھائی جاتی تھیں اور اوما بنجال نکارام کے بھجن گاتی تھی۔ ملاقاتی ایک لمحے کے لئے چوندھیا جاتا ہے۔ اگر لب کشائی کرتا ہے جو اسے کرنی ہی پڑتی ہے تو اسے برائن کاشش کے مرض میں مبتلا بتا دیا جاتا ہے اگر وہ اس سے انکار کر بیٹھے یا بحث پر اتر آئے تو سمجھ لیجئے کہ وہ انیڈی سائنس کا

مریض تو ضرور ہی ہے ان کے ذہن کی ترائی میں آج بھی وہ اسٹیشن بسا ہے جہاں سخت اندھیرے ایک خوبرو اور نوخیز لڑکا کھڑکی سے سر نکال کر بڑے معصوم لہجے میں پوچھتا ہے۔ چھلیند ے لیجئے گامس بابا اور وہ نرائن مالی بھی جس کے گھر کے کشادہ آنگن میں بیٹھ کر امرود کھائے جاتے تھے اور اس خدا کو یاد کیا جاتا تھا جو انہیں ٹھنڈے خاموش پانیوں کے کنارے کنارے لے جاتا تھا۔ جہاں اگر دماغ واپس مل گیا ہوتا حالات نے کچھ سنبھلنے اور سوچنے کی مہلت دی ہوتی تو سینٹ کو لمبا کے ساتھ چار شمعیں جلائی جاتیں۔ ان کا دماغ میرے بھی صنم خانے میں ہے اور دل آگ کے دریا میں دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن نہ دماغ ہی واپس ملا اور نہ دل کی مراد ہی برآئی۔ نہ شمعیں جلیں اور نہ وہ توازن ملا جس کی تلاش میں اک عمر بسر ہوگئی۔ جسکی تلاش وجستجو تھی نہ ملا نہ سہی جینے کا فن اور زندگی کرنے کا سلیقہ تو آگیا۔ اسے چاہے کسی بھی نظر سے دیکھا جائے لیکن ان کی طمانیت کا سامان اسی میں ہے اب کسی کو بھی لے کر اپنے سنڑ کو لوٹ سکتی ہیں اور سینڈوچ کا ناشتہ کر کے آرام وسکون کے ساتھ سو سکتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر ناول میں زندگی کے کھیل کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ واقعات۔ انسانوں کے اعمال اور کرداروں کے ارادوں کی کشمکش اپنے تمام بنیادی محرکات کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے زندگی تو اتنی وسیع ہے کہ اس کا ایک دن بھی اپنی تمام تہوں کے ساتھ پیش کرنا مشکل ہے لیکن انہوں نے اپنی صلاحیت کے بھروسے پر مقدور بھر کوشش کی ہے اور فن کا دامن تھامے ہوئے ایک

حد تک یہ منزل کے قریب بھی آ گئی ہیں۔ سماجی پس منظر کو ابھارنے میں انہوں نے اپنے کرداروں سے کام بھی لئے ہیں اور زندگی پر بھرپور تبصرہ بھی کیا ہے اپنی معلومات کے خزانے سے واقفیت بھی بہم پہنچائی گئی ہے۔ ان کی آستین میں روشنی کا سیلاب ہے اور یہ زندگی کے گوناگوں اور متنوع رنگوں اور اس کے اتار چڑھاؤ سے بڑی حد تک واقف ہیں ان کے یہاں عملی اور بیان کے ساتھ ڈرامہ اور مصوری یکجا ہوئے ہیں جن کی بدولت انسانی افعال۔ ان کے محرکات اور زمان و مکان بحیثیت کردار سامنے آتے ہیں۔ یہ اس زاویہ نظر پر بھی توجہ دیتی ہیں۔ جو مختلف اجزا کو ترتیب دے کر ایک کل بناتا ہے زندگی کی طرح ان کے ناولوں میں تسلسل ربط اور ڈھیلا ڈھالا نظم ہے لیکن زندگی کے کچھ مسائل ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر حل ہو جاتے ہیں۔

ناول کے جدید رجحان یعنی شعور کی رو کی وجہ سے ان کو کافی شہرت اور مقبولیت ملی۔ یہ کردار کی خارجی شخصیت کے بجائے اندرونی شخصیت کی نفسیاتی پرتوں کو دیکھتی ہیں۔ جس کے لئے اظہار کا بلا واسطہ بالواسطہ یا خود کلامی والا لہجہ اپناتی ہیں۔ یہ خود توجیہ نہیں کرتیں بلکہ کردار خود اپنا ذہن اور نفسیاتی کیفیت بیان کرتا ہے ان کے کردار احساس و جذبات کے پیکر ہیں یہ اقتصادی مشینری کے بے جان کل پرزے نہیں بلکہ جیتے جاگتے یہ انسان ذہنی الجھن بھی رکھتے ہیں۔ نفسیاتی گتھیاں بھی امنگیں اور آرزوئیں بھی خواہشات اور جذبات بھی متحرک زندگی کی یہ تصویریں مسرت شادمانی حسرت اور ناکامی سے بھی دوچار ہوتی ہیں نفسیاتی تجربہ اور تحقیق کی تکنیک اپنا کر انہیں زندگی بخش

دی گئی ہے۔

ان کا موضوع مغرب پسند تعلیم یافتہ افراد کی زندگیوں کی عکاسی بھی ہے متوسط ہندو گھرانوں کا ماحول اور عام متوسط طبقے کے مرد عورت کلرک ماسٹر اور استانیوں کی زندگیوں کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اودھ کے ماحول تعلقہ داروں اور رئیسوں کی زندگیوں کا احاطہ بھی کیا ہے۔ لیکن اس زندگی کے ٹھاٹ باٹ کے بیان میں تکلف اور تصنع ہے سیاسی اور سماجی مسائل بھی ہیں لیکن ان کے حل کرنے میں اظہار تو ہے مکمل نہیں ہے سیاست میں سوشلزم پر ان کا ایمان ہے جو سارے مسائل کا حل ہے لیکن ان کے بہت سے نظریات و نتائج سے اختلاف کی بھی بہت گنجائش ہے۔ یہ ذہنی طور پر قیام پاکستان کے خلاف ہیں ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کی بربریت اور درندگی سے یہ دل برداشتہ ہیں لیکن ان کا یہ احساس ذاتی اور شخصی نوعیت کا زیادہ ہے۔ انسانیت کے دل کی دھڑکنیں اس میں کم محسوس ہوتی ہیں۔ تاہم انسانیت کی طرف ان کا یہ شدید رجحان ان کی انسان دوستی کی طرف اشارہ کرتا ہے انسانوں میں دبا ہوا احساس تنہائی محرومی اور شدید کرب و اذیت ہجرت سے پیدا ہونے والے اس خلا کی بدولت تھا جو زندگی اور اس کی اعلیٰ اقدار کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ یہ اس نسل کی ترجمانی ہے جسے ایک ثقافت ایک تہذیب سے کٹ جانے کا شدید غم و ملال ہے تقسیم وطن کے سانحے نے ان کے فن پر اثر ڈالا ہے اس موضوع اور اس سے پیدا شدہ کرب کے آتے ہی صفحات آنسوؤں کی نمی

سے جھجکتے معلوم ہوتے ہیں۔ قرۃ زندگی کی گہری صداقت کو سمجھ گئی ہیں اور افراد کی اندرونی تبدیلی کا مطالعہ کر کے پھر زندگی کو اس کے اجزا کے باہمی تعلق کے ساتھ اس طرح پیش کرتی ہیں کہ کرداروں کی شخصیت زندہ ہو جاتی ہے۔ اور پھر ان ہی کرداروں میں سے ایک جاندار مرکزی کردار ابھرتا ہے انہوں نے ناول میں زمین کی حرکت اور اس کی پرچھائیوں کو سمونے کی کوشش کی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انہیں انسان اور انسانی زندگی سے محبت اور دلچسپی ہے یہ قاری کے ذہن کو بھی   ہیں

یہ ناول کے بنیادی اجزا یعنی موضوع کردار نگاری پس منظر زبان مکالمہ دائرہ عمل اور باہمی ربط سے اچھی طرح واقف ہیں یہ اپنی مطالعہ کردہ زندگی کے پہلوؤں کو مشاہدے اور بصیرت کے بل پر اس طرح بیان کرنے کی قدرت رکھتی ہیں کہ وہ زندگی کے واقعات سے دست و گریباں اور مربوط و مبسوط نظر آتے ہیں۔ محض تخیل کی پیداوار نہیں معلوم ہوتے ان کا موضوع بطور کل ذہن میں آجاتا ہے اور فطرت سے بھی قریب تر معلوم ہوتا ہے ان کی شخصیت فعال ہے ان میں انتخاب ترتیب، اور فیصلہ کرنے کی قوت ہے اور اپنے فیصلے کی منطق کو یہ دردمندی ترغیب اور فنی تاثیر سے منوا بھی سکتی ہیں ان کے موضوع اور مزاج میں ہم آہنگی ہے یہ اپنے تصور کا ساتھ دیتی ہیں لیکن کہیں کہیں دائرہ عمل سے باہر بھی قدم رکھ دیتی ہیں اور کہیں تصور کی صداقت کا احترام بھی کرتی ہیں۔ یہ سمجھتی ہیں کہ ناول کا فن بہرکیف انسانی اعلیٰ اغراض کی خدمت کا فن ہے۔ اعلیٰ پایہ کی قدروں پر ناول کی بنیاد رکھ کر ان چیزوں

اور ان جزئیات و محرکات اور زندگی کے ان گوشوں کا احاطہ کرتی ہیں جو ان کے رگ و ریشے میں پیوست ہیں اور تنگ نظری سے ہٹ کر انسان دوستی کے طفیل اچھا ادب فنی چابکدستی کے ساتھ پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں ان کے ناول کا مقصد ایسا تو نہیں ہے کہ پڑھنے والا زندگی کی عملی تعمیر میں حصہ لینے پر مجبور ہو جائے۔ تاہم ان کے پاس وہ بصیرت ہے کہ خارجی واقعات اور زندگی کی پوشیدہ حقیقتیں اس کی گرمی سے پگھل جاتے ہیں۔ ان کو اپنے علم اور فن پر اعتماد بھی ہے اسی لئے ان کی بنائی ہوئی تصویریں زندگی کے بدلتے ہوئے روپ کی ترجمان ہیں ان کا کینوس اتنا وسیع اور بسیط ہے کہ وہ پوری انسانیت، سارے سماج اور تمام دنیا کا احاطہ کئے ہوئے ہے اردگرد کا مطالعہ انہوں نے بڑی توجہ۔ ژرف نگاہی اور آنکھیں کھول کر کیا ہے قدرت سے انہیں قوت مشاہدہ اور اس کو کام میں لانے کی صلاحیت ودیعت کی گئی ہے۔ اور پھر انہوں نے اپنے باریک مشاہدے۔ تیز احساس اور ہمہ گیر عقلی تجزیے سے کام لے کر نئے ادبی سانچوں کو جنم دیا ہے اپنے زاویہ نظر کی مدد سے مواد کے انتخاب۔ ترتیب اور نتیجہ اخذ کرنے میں مدد ملی ہے۔ نئی تہذیب سے پوری طرح آگاہ ہونے کے بعد اپنی قوت تخیلہ سے توازن اور تناسب دریافت کر کے جو کردار انہوں نے اُبھارے ہیں۔ وہ زندہ متحرک اور جاندار ہیں ان میں نئے اقدار کو جنم دینے کی قوت ہے

یہ ماضی و حال کے حالات کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ سارا تہذیبی پس منظر مربوط شکل میں سامنے آجاتا ہے انہوں نے نئی تہذیب کے گرم

لاوے کو آنکھ سے دیکھا ہے اور ہاتھ سے چھوا ہے۔ مشاہدے سے کام لے کر اور زندگی برت کر سنجیدگی اور توازن کی تلاش کی ہے بہت سے اوراق ایسے ہیں جو پلکوں کی اوس سے نم ہو جاتے ہیں اور اس کھوکھلی تہذیب سے متنفر ہو جاتا ہے جس نے ہم سے ہمارا ماضی چھین لیا یہ اپنے کرداروں کے ذہنی عمل کو دیکھ کر ضبط و تفکر سے انسانی خد و خال کا مطالعہ کرتی ہیں جس سے وحدت اور مجموعی تاثر پیدا ہو جاتا ہے کردار پلاٹ کے سینے سے ابھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور زندگی پر چھا جانے کی کوشش بھی کرتا ہے ان کا ماحول زندگی پر تنقید کے ساتھ رزمیہ کی سی وسعت کا تصور پیدا کرتا ہے۔

اسلوب کی شعریت کے سہارے یہ مخصوص فضا اور مجموعی تاثر پیدا کرتی ہیں دلربا ناولٹ سے پہلے یہ اس بورژوا ماحول کی عکاسی کرتی رہی ہیں جس کی یہ پروردہ ہیں۔ اور جس سے انہیں پوری طرح آگاہی بھی ہے۔ دلربا میں متوسط طبقے کی عکاسی کر کے یہ کچھ حقیقت پسند بھی ہو گئی ہیں ان کے دوسرے ناولوں میں جو فوٹوگراف کا سا انداز ہے۔ شعور کی رو اور وقت سے ایک خاص دلچسپی کے طفیل یہ ماحول کے سارے طلسم اور لمحات گریزاں کو اسیر کرتی ہیں یہ اور بات ہے کہ ڈاکٹر محمد حسن کو ان کے ناول میں پھیلاؤ اور بکھراؤ ٹکنیک کے بجائے عادت معلوم ہوتا ہے۔ ممتاز شیریں کو ان کے یہاں انگریزیت ترکیت سوریت۔ لکھنویت اور ان سب سے پیدا ہونے والی بورژوا ذہنیت کی عکاسی

اور رومانیت سے بھرا آئیڈیل ازم نظر آتا ہے وقار عظیم ان کے ناولوں کو داستاں کی طلسمی فضا سے ناپنے کی کوشش کرتے ہیں اور عبادت بریلوی کو ان کے یہاں محض رومانی پرواز اور تخیل کی اڑان معلوم ہوتی ہے اس جاگیردارانہ نظام پر جہاں ہر چیز پر ایک غنودگی چھائی ہوئی تھی اور ہر چیز سیاہ غلاف میں لپٹی ہوئی تھی۔ انہوں نے کچھ کاری ضربیں بھی لگائی ہیں۔ ان کے کردار سوسائٹی کے اجتماعی عمل میں حصہ تو لیتے ہیں لیکن ان کا حربہ سلامت روی ہے یہ طوفانوں کے خواب دیکھ سکتے ہیں طوفان برپا نہیں کر سکتے۔ لیکن ان سے وہ ایثار بہ تو مل ہی جاتا ہے جو نئی شکل میں نئی نسل میں پیدا ہو چلا تھا۔ ان کے یہاں اجتہاد کا یہ اظہار ہمارے تصور کو وسعت اور ہماری انا کو تسکین پہنچاتا ہے اور ایک تازگی پیدا کر کے ان کے فن کی داد دلوایا ہے۔ ان کے کرداروں کی زد میں زمانے بھر کی گردشیں ہیں لیکن عملی پہلو تشنگی لئے ہوئے ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ ہر فرد اور ہر شے کی قدر وقیمت سے آگاہ ہیں۔ اور ان پر اتنا ہی وقت صرف کرتی ہیں۔ جتنا ضروری ہے۔ تفصیل اور جزئیات کا بیان جہاں کردار یا زمانے کی داخلی زندگی دکھانے کے لئے آیا ہے۔ بیشتر مقامات پر گوارا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بے جا تفصیل کہیں کہیں کھلتی بھی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کی کہانی اور اس کو پیش کرنے کا انداز دلچسپ فنی اور پرکشش ہے۔ زندگی سے قریب ہے۔ اس میں آغاز وانجام کا ایک دائرہ ہے یہ فنکارانہ اعتماد سے خاکوں میں تڑپ بھی بھر سکتی ہیں جن میں گہری واقفیت اور واقفیت کا ایسا وثوق ہوتا ہے کہ اس کی صداقت پر شک وشبہ کی پرچھائیاں نہیں پڑتیں

کسی چیز کو جاننے یا کسی نضا کو متعین کرنے کے لئے جن تین بنیادی سوالوں۔ کب کہاں اور کیوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ان کا بھرم بھی قائم رہتا ہے اور جواب بھی مل جاتا ہے ان کے سینے میں کشادگی اور دل میں انسانیت کا سوز بھی ہے اسی لیے ان کا قاری کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ کردار کی تشکیل اور فنی ترتیب اتنی سڈول ہے کہ فن پر اعتماد اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اور ناول زندگی کی زمین سے ابھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے واقعات کی زنجیر۔ موضوع اور ساخت کی ہم آہنگی واقفیت اور معلومات کے چہرے سے نقاب اٹھاتے نظر آتے ہیں۔

آگ کے دریا میں داخلی خود کلامی کا پر اثر انداز ہے آگ کا دریا تہذیب کا نوحہ ہے جو ابتدائی ہندوستانی تہذیب کے دور سے لے کر نئے ہندوستان کے عہد تک تہذیب اقدار اور تاریخ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے ۲ ½ ہزار سال قبل کی شراوستی تہذیب پاٹلی پتر کا عہد رفتہ اور اسکے بعد مسلم تہذیب کے اشتراک سے مشترکہ تہذیب۔ ہندو مسلم کلچر کا امتزاج مشترکہ تہذیب کی بیخ کنی۔ اس تصادم میں تعصب۔ توہمات اور منافرت سے ہٹ کر روشن خیالی اور مشرقی و مغربی اقدار کی آمیزش۔ پھر آزادی۔ اور ہندوستان کی تقسیم۔ ملک کا بٹوارہ اور اس سے پیدا شدہ معاشی۔ معاشرتی اور جذباتی مسائل۔

قرۃ نے چند روشن منزلوں کو چن کر ہندوستانی روح کو بے نقاب کیا جہاں یورپ کے واقعات اور نظریات کی جھلکیاں بھی ہیں ان کا یہ قول۔

"ساری دنیا۔ ساری کائنات کا تجزیہ تو نہیں کیا جا سکتا مگر تلاش ایک نکتے سے تو شروع ہو سکتی ہے" انہیں پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

دو وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی وہی طلعت اسی پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا۔ اور اس فاصلے پر صرف آگے کی طرف چل سکتا ہے آگے اور آگے پیچھے جانا ممکن نہ تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں جیسے آئینہ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔

"چٹانیں۔ اولانش۔ گلیشر آندھیاں۔ طوفان۔ جھکڑ ان سب میں سے گزرتا ہوا ئسر کی لہروں پر بہتا وہ گوری شنکر کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر بادلوں میں چھپ گیا چوٹی پر وہ دوزانو بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا چاروں اور خلا ہے اور اس میں وہ ہمیشہ کی طرح تنہا موجود ہے دنیا کا ازلی و ابدی انسان تھکا ہوا شکست خوردہ بشاش پرامید انسان جو خدا نہیں ہے اور خدا ہے"۔

"انسان چراغ کی طرح بجھ جاتا ہے محض واقعات اور احساسات کا تسلسل باقی رہتا ہے۔"

ہری شنکر اک ایسا کردار ہے جس کی شخصیت میں توازن ہے اور جو وحدت لئے ہوئے ہے۔ گوتم تجربے کی آگ میں تپ کر بالغ نظری کا حامل ہوتا ہے اور روح کی دنیا سے دل کی دنیا کی سیر کرتا ہے۔ لیکن یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب دل میں محبت ایثار اور خلوص کے جذبات ابھرتے تھے

لوگ زندگی کی اعلیٰ و ارفع اقدار مانتے تھے۔

بہ اس ایک رات میں وہ دفعتاً بڑا ہو گیا اس نے دل کی کائنات کی سیاحت کی تھی اس نے مایا کا تجربہ کیا تھا۔"

حالات و نظریات کے ٹکراؤ میں کمال کی شخصیت کے ٹوٹنے کا کرب ہندوستانی تہذیب کے خلفشار کا کرب اقدار کے تباہ و برباد ہونے کا کرب یہ سب سمٹ کر چمپا کی روح میں اتر گئے ہیں اور وہ خاموش احتجاج بن کر رہ جاتی ہے۔

" میں ایک اوسط درجے کی لڑکی ہوں۔ اگر میں خدا کا خاص بندہ ہوتی میرا۔ مکتا بائی۔ سینٹ صوفیہ تو میرے جسم پر زخموں کے نشان نظر آتے۔ میرا لبادہ میری تقدیس کے خون سے سرخ ہوتا میرے ہاتھوں میں میخیں گڑھی ہوتیں۔ میرے سر کے گرد نور کا ہالہ ہوتا مجھے وش کے پیالے اور سانپ کے پٹارے بھجوائے گئے ہوتے۔ لیکن میں محض چمپا احمد ہوں میرے زخم کسی کو نظر نہیں آ سکتے۔ کیونکہ میرے تماشائی میری طرح زخمی ہیں وہ کمزور اور فانی انسان ہیں چشم بینا نہیں رکھتے۔"

یہ آگ کے دریا کا سب سے زیادہ توانا کردار ہے جو زندگی کے مثبت نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن میں خود اعتمادی اور تحریک کی بھاونا ہوتی ہے باقی سب ارادہ بندی کے غلام ہوتے ہیں۔ کبیر جائسی اور نانک بھگتی تحریک کی پیداوار ہیں آگ کے دریا کے کردار عقل و عشق فرد و حکومت۔ شعور اور لاشعور مذہب اور سائنس خدا اور کائنات وجود

اور عدم وجود سے پیدا شدہ کرب اور مسرت کی تصویر کشی کرتے ہیں گوتم نیلمبر، ہری شنکر ویدک دور کے عالی ابوالمنصور اور چمپا اسلامی دور کے اور سرل ایشلے انگریزی دور کے ترجمان ہیں۔ لکھنؤ اور یورپ کی زندگی سے متعلق ناول کا تیسرا دور ہے جو تہذیب کے ارتقا اور تسلسل کو ظاہر نہیں کرتا اس کا پہلو معاشی اور سیاسی ہے۔ یہ ایک نظام کے انحطاطی پس منظر میں نئے ذہن کی نمائندگی کرتا ہے جہاں کردار اپنے آپ کو دہراتے نظر آتے ہیں۔ وہ ناول کے کمزور ترین حصے ہیں ذہنی ماحول کی آمیزش نہ ہونے کے وجہ سے کردار اصلی دھارے سے مرکز محور میں چھپنے معلوم ہوتے ہیں دلکشا کے باغوں میں پکنک کا منظر بہت ہی خوبصورت اور دل آویز ہے نواب قدسیہ محل اور چمپا کے درمیان مکالمہ تخلیقی ہوتے ہوئے بھی ماضی کے بہت سے نقوش ابھارتا ہے نرملا کی موت میں زندگی کا المیہ ہے۔ پرزور بیانیہ قدرت، فطری مناظر کی تصویر کشی۔ جذبات و احساسات کی ترجمانی ڈرامائی تاثر۔ قوت مشاہدہ کی گرانی تجربے کے آنچ اور تخیل کی پختہ کاری نے ناول کو مروجہ فنی اور فکری سطح سے بلند کر کے اہم فنی صنف بناتا ہے اور قرۃ کے لئے ادب میں ایک اعلیٰ مقام دلوایا ہے۔

کردار کے واقعات ایک دوسرے کی زندگی سے اس طرح گتھے ہوئے ہیں ہمارے ذہن کی تہین سے تہین تہیں بھی کھل جاتی ہیں اور ان کی ذہنی کشمکش۔ جذباتی ہیجان کمزوریاں اور اچھائیاں اس طرح اثرانداز ہوتی ہیں کہ پوری کہانی زندگی کی مسلسل رو میں تبدیل ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے چونکہ ان کی دریافت اور بازیافت میں احساس و فکر کی قوتیں کھب

کھپ گئی ہیں اسی لئے یہ ہم کو سچی تسکین عطا کرتے ہیں اپنے زاویے اور اشاریت کی خوبی کی وجہ سے ان کی بنائی ہوئی تصویریں اپنے ہم عصروں کے بنائے ہوئے پیکروں سے مختلف توانا اور جاندار ہیں۔ زندگی پر تنقید کرداروں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے اور عمل بڑی حد تک صداقت پر مبنی ہے یہ کہانی کو کھانچوں جھول اور تضاد سے بچا کر حالات و واقعات کی رفتار اور واقعات کے تسلسل کو فطری بے ساختگی کے ساتھ اس طرح انجام پذیر کرتی ہیں کہ منطقی بھی معلوم ہوتا ہے اور ذہن اس کو قبول بھی کر لیتا ہے یہ اپنے موضوع کے مخصوص امکانات کو بروئے کار لا کر بھرپور پس منظر کے ساتھ متاثر کن انداز میں پیش کرنے کا فن جانتی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ فنی عمل دریافت کا عمل ہے۔

ان کے ناولوں کو جب ہم تفصیل۔ تصادم اور ترجمانی کی کسوٹی پر کستے ہیں تو مختلف ٹکڑوں میں ڈرامائی توانائی محسوس کرتے ہیں فن کے مطالبوں سے آگاہی بھی ہوتی ہے اور دماغ بھی ایک کردار کی طرح کام کرتا ہے۔ قرۃ نے مشرق و مغرب کی قدروں کے تصادم سے پیداشدہ ردعمل۔ آمادہ رو بہ زوال معاشرت کی عکاسی۔ نئے تہذیب کی لعنتوں اور برکتوں کے بیان سے ایک ایسا کل بنایا گیا ہے۔ جو مکمل بھی ہے اور جس میں بہت سے مختلف اقسام کے رنگ برنگے فانوس روشن ہیں۔ قرۃ کی کہانیوں کا امکان وقوع خلاف عقل و قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ انہوں نے جذبہ محبت کو جزو اعظم مان کر پلاٹ کی متوازن۔ متناسب اور معقول تعمیر کی ہے۔ جزیات کے ابھارنے میں موقع محل اور کمی و بیشی کا خیال رکھا گیا ہے ٹکنیک میں عقلیت اور منطقیت

ہے مکالموں کا بیان فطری ہے اور ہیئت مزاج اور عقل سے کھاتی ہے اور فن کے معیار پر پوری اترتی ہے اچھی اور بڑی بات یہ ہے کہ قرۃ نذیر احمد کی طرح خود بیچ میں کود کر اور بے ضرورت ایک لمبا لکچر دے کر ٹکنیک اور فنی مبادیات کو مجروح نہیں کرتیں۔ ذوق خود نمائی کو یہ ناول کے تناسب اور توازن کے لئے زہر سمجھتی ہیں ناول ان کے نزدیک زندگی کو نئی شکل دینے کا فن ہے قرۃ کا رومانی انداز بھی ناول کے ارتقا میں جان ہی پیدا کرتا ہے یہ شاعرانہ زبان سے نثری زبان کی طرف اب پلٹی ہیں یہ Harmonic یعنی رنگ جمانے والے الفاظ سے صورت حال کے مطابق فضا بناتی ہیں۔ زبان کے داخلی اور خارجی بحران سے انہیں نہ تو جھوجھنا پڑتا ہے اور نہ اس کے استعمال میں دقت محسوس ہوتی ہے یہ نجی زبان۔ سماجی زبان عالمی ادبی زبان اور ان سب کے لفظی سرمایے انسانی نفسیات اور سماجیاتی سمتوں سے واقف ہیں انہیں اپنے مطالعے مشاہدے اور فن پر بھرپور اعتماد ہے۔

قرۃ العین حیدر کو پرکھنے کے لئے ہمارے پاس میرے بھی صنم خانے اور آگ کے دریا کے علاوہ جلاوطن ہاؤسنگ سوسائٹی۔ ستا برن۔ سفینۂ غم دل اور دلربا (ناولٹ) ہیں۔ دلربا کو چھوڑ کر سب پر ماضی اور جاگیردارانہ نظام کی شدید گرفت ہے۔ جہاں جاگیرداری نظام کا کروفر ایک جاندار سحر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے انحطاط اور زوال پر آنسو بھی بہائے گئے ہیں شعور کی رو اور وقت ان کے مرغوب موضوعات ہیں وقت سے لمحات گریزاں کو اسیر کیا گیا ہے اور شعور کی رو سے کرداروں کے ظاہر کے بجائے باطن کی روح داخلی شخصیت

اور ذہنی حالات کو دکھایا گیا ہے طویل مکالمات میں وہاں شگفتگی اور چستی ختم ہو جاتی ہے جہاں پر کرداروں کے ارتقا میں خارج ہوتے ہیں۔

دلربا میں مکالمے چھوٹے اور جامع ہیں جن سے کمال فنکاری کے ساتھ گلزار بائی کی تاجرانہ ذہنیت شفاعت حسین کی جھلاہٹ کندن کی جہالت اور ناسمجھی رستم جی کی ہنجری رفاقت حسین کا تکبیر اور نخوت ان سب کی عکاسی بڑی فنی چابک دستی کے ساتھ کی گئی ہے یہاں آتے آتے قرۃ کو سماج کے دونوں طبقوں سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ ان کی انسان دوستی اور ہمہ گیر انسانی ہمدردی پر دلالت کرتا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلربا کی گلزار کا موضوع انہوں نے رسوا کی امراؤ جان ادا سے لیا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں یہاں انداز اور ماحول نیا اور اپنے زمانے کے مطابق ہے۔ فکر کی نئی جہتیں ہیں سماج کی جکڑ بندیوں کے باوجود وہ بڑی حد تک گلنار کے اندر کی عورت کو باہر لانے میں کامیاب ہو گئی ہیں تقسیم وطن کے دلدوز سانحے پر وہ ہمیشہ ملول اور خاصی جذباتی ہو جاتی ہیں لیکن یہاں اس المیہ پر بھی شگفتہ مزاجی کا روغن چڑھ گیا ہے "بعد از جنگ انگلستان نے اٹھا کر ہندوستان کو آزاد کر دیا" لمحات گریزاں کو گرفت میں لینے کی یہاں بھی کوشش کی گئی ہے۔ گلنار بائی کبھی کبھی سوچا کرتی تھی کہ تھیٹر ہال یا سنڈوے کی اسٹیج تو خیر ہے ہی۔ مگر دنیا کا منڈوا اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے اور کہیں پر تیکھے جملوں سے ظرافت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک جگہ اردو شاعری کا خاکہ اڑانے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں یہ معمولی سا جملہ پوری شاعری پر بھرپور تنقید ہے۔

"گُلرو جب اس مصرعہ پر پہنچی۔ اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل ...
اجو نے خود ہی چپکے سے شفو کے کان میں ترجمہ کیا۔

Do not Buryme in your lane
After Murdering me

قرۃ کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اسلوب سے شعریت کے سہارے مخصوص اور غنائی فضا اور مجموعی تاثر پیدا کر سکتی ہیں۔ اور الفاظ سے رنگ و بو کا کام لے کر ماحول کو اور پوری فضا کو سحر آگیں بنا دیتی ہیں ان کے ناول میں الفاظ سے پینٹنگ۔ برش اور رنگوں کا کام لیا گیا ہے فوری جذبے ذاتی پسند کا وقتی نہیں بلکہ محسوسات کا بے ساختہ اظہار ہے یہ ایک ڈھنگ سے مضمون کو سو طرح باندھنے کے فن میں مہارت رکھتی ہیں اگر وہ ناول نگار نہ ہوتیں تو بہترین شاعرہ ہوتیں۔ لیکن انہوں نے نثری اظہار کو ناول کے ذریعہ ترسیل کا ذریعہ بنا کر اس لئے احسان عظیم کیا ہے کہ شاعری میں تو چند بندھے ٹکے موضوعات اور خیالات ہوتے ہیں جن کی تکرار ہی ابتدا سے ابتک ہوتی رہی ہے چند شاعر ہیں جنہوں نے فکر دے کر شاعری کی لاج رکھ لی ہے

اپنے اولین ناولوں میں قرۃ کی نگاہ بورژوا طبقہ پر پڑی۔ جس کی وہ پروردہ تھیں تعلقہ داری۔ جاگیرداری۔ یادِ ماضی۔ لکھنؤ اور اس میں خاص کر امین آباد وغیرہ کی عکاسی کا انداز اینڈرسن کی داستانوں کی فضا کا طلسم اور امیر خسرو کے دو سخنو کی حیات تازہ کی یاد ضرور دلاتا ہے لیکن ناول کے فن پر پورا اترتا ہے۔ قرۃ اپنے ناولوں میں کئی کئی نسلوں کو سمیٹ لیتی ہیں۔ ان کی

تصویر کا کینوس وسیع و عریض بھی ہے اور تازہ کار بھی آگ کے دریا اور میرے بھی صنم خانے کی طرح دلربا میں ان کی بساط بڑی بسیط ہے یہ ۱۸۵۷ سے شروع ہو کر ۱۹۶۷ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس مختصر سی کہانی کا دائرہ بھی لکھنؤ۔ مسوری۔ انگلینڈ سے ہوتا ہوا امریکہ تک جاتا ہے۔ کرداروں کی یکسانیت بیشتر مقامات پر کھلتی ہے۔ لیکن دلربا میں واقعات اور کرداروں کے ارتقا پر بھرپور توجہ دی گئی ہے۔ اس کے بہت سے ٹکروں میں بڑی توانائی ہے۔ مثال کے طور پر صرف ایک نمونے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ "گلنار سوچنے لگی۔ قسمت کی ستم ظریفی۔ پیدائش کے اتفاقات۔ میں کون ہوں؟ وہ بھولی بھالی پردہ نشیں شریف زادی کون ہے؟ جو مولوی صاحب کے مدرسے میں پڑھ رہی ہے اور اس گلفام کی دلہن بننے والی ہے ہم سب کون ہیں؟ یہ سارا ماجرا کیا ہے یہ کیسا گورکھ دھندا ہے ..... تو ناحق ہم مجبوروں پر...

قرۃ نے ناول کی سطح پر بہت سے اہم سوالات اٹھائے ہیں لیکن ان کے یہاں فضا اور مجموعی تاثر غضب کا ہے اردو ناول کو قرۃ نے ارتقا کی بہت سی منزلوں سے گزار کر اس لایق بنا دیا ہے کہ ہم فخر سے سر بلند کر کے دوسرے عالمی ادب کے سامنے انہیں پیش کر سکتے ہیں۔ انہوں نے فن کی آبرو بڑھائی ہے ادب کا وقار بڑھایا ہے ان کا ناول روزمرہ کی زندگی پر مبنی ہوتا ہے ظاہری سطح پر ہونے والے واقعات۔ حادثات اور جذباتی جھکول سے ہٹا کر کرداروں کی جزئیات و تفصیلات میں ربط بھی پایا جاتا ہے ان کا ناول سرحدی ناولوں کے زبردست کٹاؤ کا تجربہ پیش نہیں کرتا

بلکہ زندگی اور اس کی اعلیٰ و ارفع اور گوناگوں کیفیات اور قدروں
کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

رشید احمد صدیقی۔ بصیرت اور فن

اردو طنز و ظرافت میں اودھ پنچ کی نسل کے بعد جو نام سب سے پہلے اور سرفہرست نظر آتے ہیں وہ ہیں پطرس اور رشید احمد صدیقی کے۔ قدامت پسندی اور جدیدیت کے درمیان کا مضبوط اور جاندار ستون رشید صاحب کی ذات ہے جن کی شخصیت میں شگفتگی اور بیزاری کے ساتھ بزلہ سنجی بھی بدرجہ اتم موجود تھی شگفتگی اور ذہنی حظ کی رو ہر اس جگہ اپنے کمال اور عروج پہ نظر آتی ہے جہاں یہ موجود ہوتے تھے۔ انجمنوں، سفر اور عام مجمعوں سے انہیں بیزاری تھی۔ بزلہ سنجی اور ادبی ظرافت نے ان کے ادبی و علمی قامت کو بلند کیا ہے۔

جو شخص علیگڈھ اس کی روایات اور ٹریڈیشن سے واقف نہیں وہ ان کی تحریروں سے زیادہ لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ادب پر انکے

قاری کی گرفت ہے تو اسے جو حظ اور ذہنی تسکین ملے گی وہ اپنا ایسا تاثر چھوڑے گی جس سے صدیقی صاحب کی علمیت کا لوہا ماننا پڑے گا۔ وہ علیگڈھ کے آئینے کو بھی صاف۔ بڑا۔ ستھرا اور معیاری سمجھتے ہیں اور اس میں نظر آنے والے عکس ہی کو مکمل تصویر سمجھتے ہیں۔ اور یہی صحیح بھی ہے اس لئے کہ پوری تہذیب اور تہذیبی ورثہ اس سے وابستہ رہا اور اسی لئے ان کی نثری تحریروں کا محور علیگڈھ کا ذرہ ذرہ۔ علیگڈھ تحریک۔ تہذیبی اور سماجی ورثہ اور وہاں کی رائج اصطلاحات ہیں جن میں بلا کی معنی خیزی ہے۔ ان اصطلاحات کو جانے پہچانے بغیر رشید صاحب کے فکر و فن اور طنز و مزاح کی تاریخ کا مطالعہ ادھورا ہے۔ مسلم یونیورسٹی جس کے لئے رشید صاحب نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔ کی تاریخ سے جو شخص کماحقہ واقف ہے اسے ان کی تحریروں میں زیادہ ادبی اور تہذیبی قدروں کے رچاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ علیگڈھ سے ان کی جذباتی وابستگی عقیدت کی حد تک تھی۔ اسی لئے علیگڈھ اور اس سے متعلق ساری روایات ان کی تحریروں پر جاری و ساری ہے ایک زمانہ تھا کہ علی گڑھ ان کے ذہن سے سوچنے کا عادی ہو گیا تھا۔ ان کی ظرافت اور اپج کا یہ عالم تھا کہ ان کے منھ سے نکلی ہوئی بات حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ یہ بظاہر محدود رنگ اپنے اندر ایک صدی سے زیادہ کی تاریخ رکھتا ہے۔ مقامی رنگ کی شوخی۔ طنز و مزاح کی چاشنی اور اقافتی زندگی کی جھلکیاں اپنے اندر ایک صدی سے زیادہ کا نچوڑ رکھتا ہے۔ کچی اور پکی بارکوں کا ذکر۔ علیگڈھ کی زبان میں مخصوص کھنچائی۔ چیقلش جہل مرکب اور یونین اور

اور اس سے متعلق الفاظ و اصطلاحات بار بار آتی ہیں جو قاری سے سخن سنجی ۔ سخن فہمی ۔ شائستہ ذہن اور شستہ مذاق کی توقع کرتی ہیں صدیقی صاحب بذات خود شرافت کو انسانیت کا جوہر مانتے ہیں ۔ اور ہر علمی انسان کی طرح اس پر بھرپور ایقان و اعتقاد رکھتے ہیں ۔ اور زندگی ۔ فن اور ظرافت میں اسی کو سلیقے سے برتنے کا فن جانتے ہیں ۔

رشید صاحب نے اپنے شائستہ اور شستہ لہجے اور خلاق ذہن سے طنز و مزاح کی تاریخ پر انمٹ چھاپ بھی چھوڑی ہے اور اس صنف کو پوری طرح سنوار کر اس کے وقار کو بھی بڑھایا ہے ۔ ان کی بیشتر تحریروں میں بھرپور تاثر ہے ۔ انہیں فقرے تراشنے کا فن بھی آتا ہے اور وہ ایسا گر بھی جانتے ہیں جس کی وجہ سے انسان امر ہو جاتا ہے ۔ ان کے نثری کارناموں میں شعر و ادب کے صدیوں کے مذاق کی بازگشت ہے یہ اردو کے صاحب طرز ۔ معتبر اور معیاری ادیب ہیں یہ انشائیہ کو بھرپور صنف اور ظرافت کی جان طنز کو سمجھتے ہیں لیکن ان کے فن اور خیال میں کسی حد تک پیچیدگی ہے گاڑھی ادبی چاشنی کی وجہ سے ان کی تحریروں سے خواص ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں انہوں نے بہت سے مضامین ایسے لکھے ہیں جن میں طنز کا دار زہرناکی کی حد تک تیز ہے ان کی ایسی تحریروں سے خون خرابے والی نوبت بھی آسکتی تھی لیکن جس طبقے نے اس سے حظ اور فیضان حاصل کیا وہ اس میں یقین نہیں رکھتا ۔ انہوں نے آئی سی ایس ۔ روشن خیال بیوی ۔ مرشد ۔ حاجی بلغ العلیٰ اور پولیس کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جدید نسل کی ذہنی کیفیت اور ان کی زندگی سے متعلق گوناگوں

سوادیات کو پیش کیا ہے مغربی تہذیب مغربی تعلیم اور دور حاضر کے اہم واقعات پر کڑی تنقید کر کے کچھ ایسی سچائیوں پر سے نقاب اٹھایا ہے جن پر سے پردہ اٹھنے کی شدید ضرورت تھی۔

ان کے یہاں شعر و ادب کے نئے نئے انکشافات تعلیم یافتہ طبقے کے مسائل۔ ان کا حل سائنس کے نظریئے اور آزاد خیالی کے کرشمے بھی ہیں۔ ارہر کے کھیت اور پارلیمنٹ کو انہوں نے ایک صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اور چارپائی کی اہمیت بڑھادی ہے۔ انہوں نے اپنے پڑھنے والوں کو شاعر۔ فلسفی اور مولوی کی گمراہیوں سے لطیف طنزیہ پیرایہ میں آگاہ کیا ہے۔ ان کی پول کھولی ہے اور انکی روایات پر کاری ضربیں بھی لگائی ہیں۔ یہ اپنے ذہن کی خلاقی کی بدولت ارہر کے کھیت میں ہائیڈپارک کے نظارے دیکھ سکتے ہیں انہوں نے ہر اس چیز پر طنز کیا ہے جو انسانی آزادی میں رخنہ ڈالتی ہے اور سکون کو برباد کرتی ہے فرد کی آسودگی کیلئے خطرہ بنتی ہے اور زندگی میں خلل ڈالتی ہے۔ یہ سرطرفہ وار کرتے ہیں گواہ ڈپٹی کلکٹر سرمایہ دار اور مزدور کو نشانہ بناتے ہیں دوسری طرف مولوی۔ سیاست داں فنکار ایڈیٹر اور استاد پر چوٹ ہوتی ہے۔ اور تیسری طرف روشن خیال بیوی۔ لیڈر اور عدم تعاون پر بھی کاری ضربیں لگاتے ہیں" اس زمانے میں لوگ اپنی کمزوریوں اور دوسروں کی بیویوں کو آرٹ سمجھتے ہیں " اگر انہیں اپنی کمزوریوں پر ہنسنا آتا ہے تو یہ دوسروں کی حماقتوں کو برداشت بھی نہیں کر سکتے۔

انکے طنز میں ظرافت کے ساتھ بلاغت انفرادی اور اجتماعی شامت کا

احساس شامل رہتا ہے۔ تیزی کنایہ اور خوش طبعی میں وہ پطرس سے پیچھے ہیں لیکن قول محال PARADOX میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ بات میں سے بات نکالنا اور بات میں نئی بات پیدا کرنا ان کا فن ہے انہیں زندگی کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ خوش دلی سے زندگی پر فتح پانا اور جیت جانا انہوں نے سیکھ لیا ہے۔ یہ پھولوں سے دل بھی بہلا سکتے تھے اور باغیچے میں اپنی فرصت کے اوقات بھی گزار سکتے ہیں۔

طنزیات و مضحکات۔ مضامین رشید۔ خنداں گنج ہائے گراں مایہ۔ آشفتہ بیانی میری۔ اور ذاکر صاحب وغیرہ مختلف کتابوں میں ان کی فطری خلاقی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ ان تمام کارناموں میں انہوں نے گذشتہ پچاس سالوں کی سیاست۔ تہذیبی مسائل۔ لسانی قضیے اور تعلیمی ڈھانچے کو علم و فکر کی حیثیت سے تلخی۔ جھلاہٹ۔ طنزیہ اور تیکھے انداز میں ہدف بنایا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور فقروں سے شگفتہ انداز پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ظرافت کے لئے خام مواد شعر و ادب اور ادب عالیہ کی اعلیٰ روایات سے لیا ہے لفظی بازی گری اور فلسفیانہ اور علمیانہ عمل کے برتاؤ سے ان کو نقصان یہ پہنچا کہ اس نے ان کے طنز کو استعاروں۔ علامتوں اور مبہم اشاروں کی ادبی ثقالت نے کچھ دبیر اور ادبی غلافوں میں لپیٹ دیا ان کے استعارے خاص انداز کی علم برداری کرتے ہیں جو شرقیت۔ ادبی صلاحیتوں علمی مذاق اور شرافت نفس کے اردگرد گھومتے ہیں ذاتی تجربے اور عمیق شاہدے اور علمی رنگ نے تاثر اور طنز کے تیکھے پن میں کہیں کہیں آفاقیت کی ایسی شان پیدا

کردی ہے جو اردو کے لئے نیک فال ہے۔

مضامین رشید اور خنداں مضامین کے مجموعے ہیں کامیاب طنز اور بہترین انشار کے نمونوں کے لئے ان ادبی وعلمی اہمیت ہمیشہ رہے گی ۔ گنج ہائے گراں مایہ میں شخصی مرقعے ہیں جو اس صنف کے بے مثال اور لاثانی خاکے ہیں یہاں گہرائی اور گیرائی میں یہ پطرس سے بھی کچھ آگے بڑھ گئے ہیں۔ ذہن کی تیزی۔ طراری اور خلاقی کی چھاپ ان کے ہر مضمون پر ہے آشفتہ بیانی میری سوانح ہے۔ اور طنزیات و مضحکات میں ظرافت کی تنقید اور تاریخ بیان کی گئی ہے جس کو اور آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ ان میں جو اشارے ہیں ان سے طنزیہ ادب کے ادبی خزانے کو مالا مال کیا جاسکتا ہے نئے طنز نگاروں کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے

رشید صاحب کے طنز کا وار بہت کم موقعوں پر خالی جاتا ہے۔ ان کا مزاح مسرت اور بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ نشانہ کبھی کبھی خطا بھی ہوتا ہے۔ وار کبھی خالی بھی جاتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی ٹکر کا طنز نگار اردو ادب میں پیدا تو ہو سکتا ہے لیکن ان جیسی علمیت کا بھاری بھرکم عالم ذرا مشکل ہی سے پیدا ہوگا۔ خود ان کے بقول "میرا مقصد آپ کی معلومات میں اضافہ نہیں تاثرات میں تنوع پیدا کرتا ہے" لیکن انہوں نے تاثرات میں تنوع بھی پیدا کیا ہے اور معلومات میں اضافہ بھی کیا ہے۔ بڑے سے بڑے مسئلہ پر بھی پند ونصائح اور اخلاقی درس دینے کے بجائے کبھی ہلکے اور کبھی گہرے طنز سے کام لے کر ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو معنی خیزی اور اپنے انداز میں اپنا جواب نہیں

رکھتیں۔ روزمرہ کے واقعات اور خشک موضوعات کے جلوہ بے رنگ میں بھی یہ دھنک کی سی دھاریاں اور شوخیاں بھر دیتے ہیں الفاظ کی شوخی اور اس کے برمحل استعمال اور تصرف سے کام لے کر سخہ کا مزا بھی بدل سکتے ہیں اور ذہن کو جلا بھی بخش سکتے ہیں ان کی رنگینیوں اور بنائے ہوئے طنزیہ پیکروں میں سحور کن ذہنی حظ ہے زندگی کی کسلاہٹ اور ذہن کی کرواہٹ کو اشعار کے صحیح اور موزوں استعمال سے ایک عجیب لطف میں بدل دیتے ہیں۔ لیکن اگر ایک طرف یہ کرواہٹ کو شیرینی میں بدل سکتے ہیں تو دوسری طرف خوش آئند مضامین میں تلخی اور زہر کی سی تاثیر اور تیزی بھی بھر سکتے ہیں۔

مضامین رشید کے مقابلے میں خنداں کا طرز عام فہم اور موضوع ہمہ گیر ہے۔ کچھ مضامین میں یہ اپنے موضوع سے دور بھی چلے جاتے ہیں۔ اور درمیان میں ایک ایسی کہانی چھیڑتے ہیں جو موضوع سے ہٹی ہوئی ہے۔ لمبی لمبی بحثیں اکتاہٹ پیدا کر دیتی ہیں۔ جس میں فارسی سے مشابہ بھی لگتا ہے۔ پڑھنے والے کا ذہن بھٹک جاتا ہے واحد متکلم کا صیغہ بھی ہر جگہ اپنا اثر نہیں دکھاتا۔ کن ہی مقامات پر دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ لیکن خنداں کے مضامین میں Originality کے ساتھ واقفیت اور گہرائی زیادہ ہے کردار معروف اور مضامین جامع۔ مختصر اور معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ طنزیہ انداز کا منفرد لہجہ رکھتے ہیں۔

ہوٹل میں ریڈیو۔ سفر۔ دعوت۔ شراب کی مخالفت امتحانات اور باغ جیسے مضامین زندہ رہنے والے جاندار اور قابل ذکر ہیں اور اردو ادب

میں اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تاثر کی فضا ہے۔ طنز کا بھرپور روار ہے۔
خنداں پیرو۔ ایڈیٹر مقرر۔ لیڈر بابو بیرا۔ بجرو اور ملاح کے کردار بڑے
دلچسپ اور رنگارنگ ہیں۔ کانفرنسوں۔ دو کانوں کونسلوں کے خاکوں میں
جان ہے۔ عاشق کی زبوں حالی اور معشوق کی ادائے دلربانہ رقیب ناصح
اور دربان کی شکاریوں کی پول کھول کر ان کی حرکات وسکنات کی صحیح عکاسی
بھی کی گئی ہے اور ان کو بے نقاب کر کے ان کی اصلیت پر سے بہت سے
پردے بھی اٹھائے گئے ہیں ان میں زباں بیان اسلوب۔ طنز لطف عبرت
اور شائستگی سب ہی کچھ ہے۔ بیشتر مضامین میں طنز یاتی روح زیادہ ہے۔
سوجھ بوجھ اچھی تازہ اور معلوماتی ہے اور تخیل میں خلاقی عیاں ہے یہ الفاظ کے
الٹ پھیر اور ان کے استعمال سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ معمولی سے معمولی باتوں
میں مضحک پہلو نکال کر ایک جدت پیدا کر دینا ان کے فن کے مبادیات پر انکی
بھرپور گرفت پر دلالت کرتا ہے۔ کردار تراشی اور جذبات کی مصوری میں یہ
گہرے اور شوخ چھینٹوں سے تصویر میں وہ جان پیدا کر دیتے ہیں کہ تصویر
منھ سے بولنے لگتی ہے بے جان مجسمے میں جان پڑجاتی ہے۔ الفاظ متحرک
ہو کر اپنی شکل اور شبیہ بنا لیتے ہیں۔ واقعات میں تسلسل اور غیر متعلق چیزوں
میں ربط پیدا کرنے میں ان کی جودت علمیت اور خلاقانہ ذہن کام دکھاتا ہے
تشبیہات استعارات اور اشعار سونے پر سہاگے کا کام کرتے ہیں۔ شہری
زندگی بسر کرتے ہوئے بھی گاؤں کے ماحول، مزاج اور معاشرت کی سچی اور
فطری عکاسی کرنا ان کی قوت مشاہدہ کا شاہد ہے۔ یہ نثر پختہ اور رواں

لکھتے ہیں۔ اور زیادہ تر ان کے طنز میں گہرائی اور ظرافت میں انفرادیت نظر آتی ہے اور یہی گہرائی اور انفرادیت انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اور طنزیہ ادب میں ایک بلند مقام دلواتی ہے۔

نظام تعلیم پر ایک جگہ بڑا گہرا اور بھرپور طنز کرتے ہیں جو اپنا اثر بھی چھوڑتا ہے اور ان کی لیاقت کا لوہا بھی منواتا ہے۔

" یہاں پر ہر ایک کو ایک قسم کا منتر پڑھاتے ہیں اور ایک ہی قسم کے سانپ سے کھیلنا سکھاتے ہیں ایک ہی قسم کے کام لیتے ہیں شکار پر گزراں کرنے والے کو مردار کھلاتے ہیں۔ کھیت جوتنے والے کو گورکنی سے واقف کراتے ہیں ہرن پر گھاس لادتے ہیں نقش نگینے کا کام کرنے والے سے مگدر ہلواتے ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والے کو یورپ کا خواب دکھاتے ہیں سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں اور ایک ہی راستے پر چلاتے ہیں۔"

یہاں رشید صاحب بجر دادا کے توسل سے ان عجائبات کی سیر کراتے ہیں جن کو شہریوں نے یونیورسٹیوں۔ کالجوں اسکولوں اور بورڈنگ کے نام دے رکھے ہیں۔

ان کے یہاں شاعر شعر اس طرح پڑھتے ہیں گویا غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنے کے نہیں۔ محض نغمہ سنج گلے کا وفور ہے اور خیالات کی وہی روایتی تکرار ہے۔ ان کے گویے مسخرے اور ان کا گانا ہسٹریا کے مرض جیسا ہے۔ یہاں کے بڑے مرچیں کھائے ہوئے ہیں روشن خیال اور

مہذب انسان اپنی بیگمات کو حالی مسدس اور دوسروں کی جوان بخت کو حافظ کی غزل قرار دیتے ہیں۔ ان کے یہاں کے ہوٹلوں میں ریڈیو سننے والوں کو اپنی تیز و طرار بیویوں کا دھڑکا لگا رہتا ہے ان کے باجوؤں سے جنگ کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ان کے ملاح ایسے ہیں دن میں چپو چلاتے ہیں اور رات میں ڈاکے ڈالتے ہیں ان کے بزرگِ قوم جھوٹ بولتے ہیں ڈینگیں مارتے ہیں اور میٹنگیں کرتے ہیں

رشید صاحب نے طنز و ظرافت کی خوش سلیقگی سے برتا ہے۔ ان کی ادبی مرقع نگاری اور طنز و ظرافت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے اور اس طنزیہ رنگ کو آفاقیت بخشی ہے۔ شکست کے باوجود زندگی گزارنا اور خوش طبعی سے اس پر فتح پانا ان کے مضامین کی بہترین قدریں ہیں ان کی شخصیت میں عظمت بصیرت علمیت ہے۔ مشاہدے میں باریک بینی اور فن میں مطالعہ کو دخل ہے۔ انہوں نے اپنے ماحول کی بے باک اور بے لوث ترجمانی کی ہے۔ ان کے یہاں ذہنی کشمکش کا عنصر غالب ہے خیال کی پیچیدگی رشید صاحب کا طرۂ امتیاز بھی ہے اور یہی ان کی خامی بھی۔ انہوں نے اظہار خیال کیلئے نئی راہیں تلاش کی ہیں لیکن کہیں کہیں یہ الفاظ کے طلسم میں پھنس گئے ہیں اور اعلیٰ درجے کی ظرافت کے لئے جس نادر اور اچھوتے خیال کی ضرورت ہوتی ہے اس کا فقدان ہو گیا ہے۔ لیکن ان کی باتیں سچی فنی اور ادبی ہیں اور ہر سچی بات بقول برنارڈ شا سب سے زیادہ ظریفانہ ہوتی ہے رشید صاحب کے طنزیہ ادب اور ظرافت اس وقت کی تہذیب کے عین مطابق ہے میری ڈکشنہ

متمدن ملک کی کسوٹی پر ٹھہراتا ہے کہ وہاں ظرافت کا تصور اور کامیڈی دونوں پائے جاتے ہیں۔ سچے اور کھرے طربیہ ادب کی پرکھ وہ یہ گردانتا ہے کہ وہ ہنسائے اور فکر کو بیدار کرے رشید صاحب کی ظرافت ہنساتی ہے اور فکر کے لئے کچھ ذہنی سامان بھی فراہم کرتی ہے۔

ارتقا مادیت اور اضافیت کے بتوں کو انہوں نے توڑا ہے ریڈیو کا مستقبل۔ فاؤنٹن پن۔ اگر میں چور ہوتا وغیرہ کچھ بڑے اچھے مضامین ہیں لیکن یہ مضامین اور بھی زیادہ دلچسپ ہو سکتے ہیں۔ عورت اور باغ سے انہیں ہر باذوق آدمی کی طرح دلچسپی ہے۔ یہ الفاظ سے کھیلتے بھی ہیں ان سے بھرپور کام بھی لیتے ہیں۔ یہ زندوں سے ڈرتے ہیں۔ لیکن مردوں پر شیر ہیں۔ یہ موجودہ حالات کی عکاسی کے مقابلے میں ماضی کی عکاسی زیادہ اچھے انداز میں کرتے ہیں ان کی ظرافت عام فہم نہیں ثقیل اور گاڑھی ہے۔ وزنی یعنی اور ادبی ہے۔ زود ہضم اور ہلکی پھلکی نہیں ہے ان کی اس وزنی اور ثقالت لئے ہوئے طنز کے لطف سے نہ زندگی میں اضافہ ہوتا ہے نہ خون بڑھتا ہے نہ چہرہ روشن ہوتا ہے۔ لیکن ذہنی غذا ضرور ملتی ہے ان کی نثر کے منفرد اسلوب میں اقبال کی شاعری غالب کے زیر لب تبسم کی شان محبوبی اور ابوالکلام آزاد کی نثری عظمت جھلکتی ہے۔ لیکن اس ادبی چاشنی اور علمیت کے زور سے انہیں فائدے اور نقصان دونوں ہی پہنچے۔ فائدہ یہ ہوا کہ ان ادبی حیثیت مسلم ہو گئی طنزیہ ادب کی آبرو بڑھ گئی اور نقصان یہ ہوا کہ ظرافت دب سی گئی ہے ان کی ظرافت میں قدر اول کی سنجیدگی ہے۔ خود ان کے قول کے مطابق طنز و ظرافت

ہنسی کھیل نہیں ہے۔

"طنز وظرافت کی مثال سفلی عمل جیسی ہے اگر عمل پورا نہ ہوا تو عامل خود اس کا شکار ہو جاتا ہے۔"

رشید صاحب اس سفلی عمل میں کامیاب ہیں۔ ان کا عمل پورا ہوا اور ادبی معیار پر بھی پورا اترا۔

رشید صاحب نے لمبی عمر پائی اور آخر وقت تک ان کے ہاتھوں نے زندگی سے نباہ کیا۔ مگر وہ زندگی کی فریب خوردہ قدروں سے زندگی بھر نالاں رہے۔ یہ غازی پور سے علیگڈھ آئے اور اس دانش گاہ کے مرتے دم تک اسیر وقتیل رہے علیگڈھ کے اس سچے عاشق نے وضع داری معصومیت اور شرافت کے ساتھ علمی ادبی دنیا میں کام بھی خوب کمایا۔ رشید صاحب استاد بھی بڑے اچھے خاصے تھے چہرہ ان کا مرثیہ گویوں جیسا ضرور تھا۔ لیکن غضب کے بزلہ سنج تھے برجستہ جملوں کے استعمال میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا علیگڈھ کی یونین میں تقریر کر رہے ہیں سب لوگ جمع ہیں لڑکوں سے ہال کھچا کھچ بھرا ہے دوران تقریر ایک موقعہ ایسا آتا ہے کہ شعر پڑھنا چاہتے ہیں۔ شعر یاد نہیں آتا۔ سرور صاحب بھی تشریف فرما ہیں انہوں نے شعر پڑھ دیا۔ رشید صاحب نے ہنستے ہوئے برجستہ کہا۔ "بھئی سرور صاحب کو شعر یاد رہتا ہے اور ہمیں شعر کا مطلب۔

اب ایسے لوگوں کے لئے دنیا سمٹتی سکڑتی اور محدود ہوتی جارہی ہے۔ ابھی ان کے فن پر کام کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ کچھ کام

ضرور ہوا ہے لیکن وہ ان کے شایان شان نہیں ہے طنز و ظرافت
کی تاریخ میں ان کی حیثیت مسلّم اور مستند ہے اور رہتی دنیا تک قائم
رہے گی۔

فراقؔ صاحب کی اردو شاعری

فراق گورکھپوری جن کا پورا نام رگھوپتی سہائے ہے اپنے تخلص کی بدولت امر ہو گئے ہیں۔ یوں تو ان کی کئی حیثیتیں ہیں۔ لیکن یہ اپنی اردو شاعری ہی کے بل بوتے پر زندہ رہیں گے ۲۷ راگست ۷۷ ۱۹ء کو انہوں نے اپنی عمر عزیز کی اکیاسی (۸۱) منزلیں طے کر لی ہیں اور تقریباً ۵۴ برس سے شاعری کر رہے ہیں۔ اور آج بھی انہیں پیسے ایڈوانس دے کر جتنے یہ کہیں غیر مشروط طور پر مشاعرے میں شرکت کے لئے آمادہ کیا جا سکتا ہے اس طویل العمری کے باوجود بھی ان میں جو دم خم ہیں اس پر جوانوں کو رشک آتا ہے آئیے اس رشک سے قطع نظر کر کے ان کی شاعری کا اک سرسری جائزہ لیں۔

۱۸ سال کی چڑھتی اور بہکتی عمر میں ان کی شادی ایک ایسی عورت سے کر دی گئی جسے قبول صورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا خوبصورتی تو بڑی دور کی

بات ہے احساس حسن سے برانگیختہ ہونے والی کیفیت ان میں سن بلوغ سے کچھ پہلے ہی بیدار ہو گئی تھی۔ اس بیداری نے انہیں حسن و خوبصورتی کا والاو شیدا بنا دیا تھا بیوی کو جب حسن کے اس معیار سے جانچا تو طبیعت صاف ہو گئی اور زندگی اجیرن ہوتی نظر آئی۔ جب حیاتِ تازہ و جوان زندہ موت میں تبدیل ہوئی ہو گی تو ان پر کیا کچھ بیت گئی ہو گی۔ لیکن مجبوری نے شکر ادا کرنے پر اکسایا۔ اگر یہ زندگی میں اچھائی خلوص اور شرافت کی اعلیٰ و ارفع قدروں سے متاثر نہ ہوئے ہوتے اور فرض شناسی اور شرافت کی قدریں آڑے نہ آگئی ہوتیں تو یہ یا تو خودکشی کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے یا کسی پاگل خانے کی زینت ہوتے۔ اور اگر ان دونوں میں سے کچھ نہ ہوتا تو یہ خطرناک قسم کے جرائم پیشہ آدمی بن جاتے لیکن انہوں نے ان میں سے کچھ نہ کیا۔ علم دوستی کو اپنا رہبر بنایا۔ اور اس کے سہارے یہ زندگی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بد دلی اور بے دماغی نے اپنا اثر جمایا۔ اندرونی ٹوٹن اور اور معیار پر بھرپور چوٹ نے دماغ کو ادب و شعر کی طرف لگا دیا۔ ایسے کرب آگیں اور تباہ کن ماحول میں انہوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ جس میں ان کی انفرادی شاعری کے خدوخال ہیں شخصیت کے نقوش ہیں۔ فطرت کا حسن اور عشق کی تڑپ اور جمالیاتی کیف ہے۔ شاعری میں انہوں نے غزل رباعی اور نظم پر طبع آزمائی کی۔ اور اس میں اس درجہ کامیابی حاصل کر لی کہ آج اردو شاعری کی تاریخ اور شعر و ادب کی بساط پر ان کی جگہ محفوظ و مامون ہے فراق وسطی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس متوسط طبقے کی ساری صفات

ان میں موجود ہیں۔ لیکن ان کے شعور کی تربیت کچھ اس طور پر ہوئی تھی کہ نازک سے نازک لمحات میں ان کا داخلی سکون درہم برہم نہ ہوا۔ بہت سے اوپری طوفانوں کو یہ شخصیت کی سطح پر جھیل گئے اور شعور کی گہرائیوں کو بروئے کار لاکر سکون و توازن اور ذہن کو افراتفری اور پراگندگی سے بچالیا۔

ان کی اردو شاعری ان کی ناکامیوں اور زخمی خلوص کا ایسا مرہم ہے جس سے زخم مندمل تو ہوئے لیکن بالکل ماند نہیں پڑے۔ ابتدائی شاعری میں جسم کی مستی نمایاں ہے۔ شروع شروع میں کچھ دن تک تو انہیں جذبات اور خیالات کے بے پایاں غلبہ نے اظہار سے معذور رکھا۔ لیکن کچھ تو ماحول سازگار ملا۔ اور کسی حد تک ورثہ کام آیا۔ ان کے والد خود اچھے شاعر تھے اس وراثت نے ان کی ابتدائی ذہنی تربیت اس طور پر تو کر ہی دی تھی کہ شعر کے مبادیات سے واقفیت کے ساتھ شعر کو سمجھنے کا ذوق بھی پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن شاعری میں فراق کے اپنے ریاض کا بڑا دخل ہے۔ رفتہ رفتہ داخلی سوز اور خارجی حالات اور ماحول کی وساطت سے انہوں نے اپنی آواز کو پالیا۔ زندگی کا کڑوا کسیلا مزہ چکھنے کے بعد فطرتاً اور طبعاً ان کی شاعری اور مزاج میں چڑچڑاپن اور جھلاہٹ آنی چاہیے تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا انہوں نے اپنی ذاتی کلفتوں اور اندرونی ہیجان پر شاعری کا غلاف چڑھالیا اور اس دبیز غلاف نے شاعری میں نکھار پیدا کردیا۔ انہوں نے پرسکون جمالیاتی اور حیات افزا اشعار کہہ کر شعوری طور پر اس تلخی کو شیرینی میں بدل دیا۔ اور پھر ایک ایسا نغمہ فضا میں گونجا۔ جس کی جھنکار اور شعری آہنگ سے ہم عصروں پر بھی تاثر مرتب کیا اور ماحول پر بھی

اثر ڈالا۔

دن تو خیر فرض شناسی کے احساس کے طفیل اس فرض کی نذر ہو جاتا تھا لیکن اس شاعر بزم شیبی نے اپنی راتوں کو شاعری کے لئے وقف دیا۔ رات کی اس کیفیت اور رمزیت نے بھی ان کی شاعری میں خوب خوب فضا باندھی ہے شب کی مصوری اور ترجمانی نے ان کے اشعار کو ایک ایسی غنودگی بخشی ہے جو افیون کی غنودگی سے قطعی مختلف ہے۔ لیکن اس میں وہ نشہ اور سرشاری ہے جس سے ذہنی حظ میسر آتا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے خوش گوار اور ناخوش گوار حالات و تجربات کا ایک سچا اور فطری جمالیاتی احساس ہے زندگی کے وجدانی شعور سے آسودگی اور طمانیت حاصل کر کے انہوں نے اپنے دکھوں کی تکمیل کی ہے اور دکھوں کی تلافی بھی ۔ فراق کے شعری محرکات نے انہیں دکھوں اور سکھوں سے اپنے لئے سواد فراہم کیا ہے

جب فراق نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ داغ اور امیر کی شاعری کا جادو اب سر چڑھ کر نہیں بول رہا تھا بلکہ اسکا انحطاطی دور شروع ہو گیا تھا۔ جب یہ انحطاط اپنے عروج پر پہنچا تو حالی اقبال اور ؔوطنیت کے راگ دلوں کو برچانے لگے تھے ہر بیدار مغز اور روشن خیال ہندوستانی کی زندگی انفرادی دلچسپیوں کی حدود کو توڑ کر آگے نکل چکی تھی۔ عشقیہ شاعری اور روایتی انداز والی شاعری اس سے کیسے آنکھ بچا کر نکل سکتی تھی۔ غزل گو شعرا نے بھی ان حالات کا اثر قبول کیا جن سے ملک اور قوم دو چار ہو گئے تھے وطنیت اور قومیت کا احساس جاگا۔ اس

تبدیلی کے بعد قومی زندگی میں بھی تغیر آیا اس تبدیلی اور بدلتے ہوئے شعری رجحان نے شاعری میں ٹرا پن پیدا کیا۔ شاعری میں خاص طور پر نظم سے کافی کام لیا جانے لگا۔ قومی زندگی کے ان ہی بدلتے ہوئے اقدار نے مل کر فراق کی عشقیہ شاعری کو پروان چڑھایا اور پھر فراق نے قومی زندگی اور عالمگیر زندگی کی اعلیٰ اور قابل قدر اقدار اور ہندوستانی کلچر کے مزاج کو شاعری میں سمو کر نئی اور جدید شعری راہوں کو لبیک کہا۔

فراق کی شاعری کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملکی اور عالمی زندگی اور ادب کے پاکیزہ محرکات کو قوت گویائی دی جائے۔ ابتدائی شاعری میں فراق کی اپنی آواز کم ہے۔ یہاں جذبات خیالات اور معیار کے معاملے میں یہ مغربی ادب سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن زبان و بیان کے لئے مشاہیر شعراء سے استفادہ کیا گیا ہے۔ شعری سانچے اور روایتی انداز وہیں سے لیا گیا ہے لیکن انہوں نے تقلید سے ہٹ کر اپنی اردو کو اپنے وجدان کے سانچے میں ڈھال کر جدت پیدا کی ہے۔ جو زندہ اور جاندار ہو گئی ہے۔ ان کا اسلوب کتابوں کی زبان سے زیادہ زندگی اور تاثراتِ زندگی کے کینڈے اور سانچے میں ڈھلا معلوم ہوتا ہے یہ بیشتر مقامات پر خیال اور کیفیت کے وجدانی پہلو کو اشاریت سے نوازتے دکھائی پڑتے ہیں۔ لیکن ۱۸ سال سے ۲۵ سال کا دور فراق کا دورِ تجربہ ہے۔ جو روایت اور تقلید کے تابع ہے۔ یہاں تک ان کی اپنی آواز دبی دبی سی ہے۔ وہ کسب فیض کرتے ہیں۔ اور وہ فضا اور شعری مزاج استوار ہو رہا ہے۔ جس نے بعد میں ان کو زندگی بخشی اور

ان کے کلام کو دوسرے شاعروں کی روش سے الگ کر دیا۔ اور ان کی شناخت بن گیا

نقالی اور مغربی پیروی سے ہٹ کر جب فراق اپنی ذاتی اپج ذہنی خلاقی اور Originality کو نظر میں رکھ کر تخلیق پر آتے ہیں تو کچھ کمال کھلتے ہیں اور اب وہ سماجی انقلابوں کے سارے پیچ و خم کو اپنی شاعری کی روح میں سموئے معلوم ہوتے ہیں۔ فطرت کے اس لطیف وحسین عکس سے ان کی شاعری رچی ہوئی دکھائی دیتی ہے فراق نے مغرب کی امیجسٹ سمبولسٹ اور سوریلسٹ تحریکوں سے بھی اپنے شعری ذوق کی رہنمائی میں مدد لی ہے۔ ان مختلف تحریکوں اور ان سے پیدا کردہ ردعمل سے کسب فیض نے فراق کی شاعری کو تنوع اور رنگا رنگی بھی بخشی ہے۔ ایک عرصہ تک ان کے یہاں جدت اور نرگسیت ہی شعر کی جان رہی۔ بعد میں کچھ آگے بڑھ کر انہوں نے اپنی راہ خود نکالی اور روایت اور اس کی کورانہ روش کو بھی ترک کر دیا اور مغرب زدگی پر ہندوستانی مزاج کو ترجیح دینا شروع کی۔ لیکن جب اشتراکیت کا دور آیا تو شعور کے اجتماعی معیار پر انہوں نے اپنے شعروں کو پرکھا اور مناسب سمجھا کہ کچھ تبدیلی کی جائے اور اسی ذہنی رجحان اور طبیعت کے جھکاؤ کی وجہ سے انہوں نے اپنے لئے جداگانہ رنگ اختیار کیا جو سب میں شمولیت اور شاعری کے مبادیات کی حدود میں رہتے ہوئے بھی ان کا اپنا اور نیا معلوم ہوتا ہے۔ مغربی ادب اور اس میں مروجہ رجحانوں اور تحریکوں کے فیضان اور امتزاج سے فراق کے یہاں ایک خاص نزاکت۔ لطافت گہرائی اور آفاقیت آگئی ہے۔ جو اردو شاعری کے لئے نیک فال ہے

فراق کے یہاں شعر کی تخلیق طلسمی فضا سے شروع ضرور ہوئی تھی اس جادوئی اثر اور شاعری کے سحر پہ مذہب نے روغن چڑھا کر اسے نشو و نما کی کئی منزلوں سے گزارا۔ تصوف نے کچھ اپنا اثر دکھانا چاہا اور پھر وجدان عقل شائستگی۔ شعری مزاج اور تہذیب اور اس کے ورثے نے ان کی شاعری کو نکھار عطا کیا۔ اور پھر یہ اشتراکیت کے جذبے پر قربان ہو گئے اور تب زندگی اور دنیا کو دوسرا رخ دینے کا تصور پیدا ہوا اس سے پہلے وہ اپنی شاعری کے لئے عشق و محبت۔ اسکی مستی و سرشاری۔ سپردگی اور خود شناسی سے مواد فراہم کر چکے تھے۔ ان تمام مرحلوں سے گزر کر فراق میں عالمگیر عمل اور عوام عالم کی متحدہ کوششوں کی معنویت۔ دوسری اور عرفان ذات اور اس کے وجدانی پہلو کو ادب میں سمونے چمکانے اور روشن کرنے کی ضرورت اور اہمیت کا احساس جاگا۔

فراق نے جنسیت کو شعوری اور وجدانی طور پر گہرا بنانے کی کوشش کی۔ جنسیات اور جنسی جذبات و تجربات سے اشعار میں لطافت اور رنگینی پیدا کرنے کا کام لیا۔ ان کے نزدیک پاکیزگی جنسی تعلق کا وجدانیت اور جمالیاتی صفات سے متصف ہونے کا نام ہے یعنی جب احساس جمال خواہش پر غلبہ پائے اور گہرا ہو جائے تو جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس نظریئے سے پوری طرح اتفاق کیا جائے لیکن اس

آواز میں ایک جدت اور نیا پن ضرور محسوس ہوتا ہے فراق نے خود اپنی اسی خود ساختہ لطیف جنسیت کو ساری کثافتوں سے پاک کر کے اپنے شعور اور کردار کا جزو بنانا چاہا ہے۔ لیکن کچھ ہی سہی گناہ معصومیت کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ وہ اپنی اغلام پرستی کے چاہے جتنے جواز پیش کریں۔ ان کی بنیاد مفروضوں پر ہی رہے گی۔ انسانیت کا صحیح نظریہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ محض جنسیت شہوانی تلذذ ہے اور عشق انسانی بہبودی اور ترقی کا زینہ عشقیہ دلچسپیاں غیر جنسی اور غیر عشقیہ امور وعوامل اور ان سے پیدا کردہ تمام رجحانات اور محرکات کو انہوں نے پہلے اپنے کردار میں سمویا اور جذب کیا اور پھر اس سے اپنی شخصیت کی اکائی بنائی۔ ان تمام مختلف اور متضاد اجزا میں جو ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرلے وہ شاعری کی پوری بساط ہی الٹ سکتا ہے۔ فراق کو اس میں پوری طرح تو نہیں ایک حد تک کامیابی ضرور ملی ہے ان کی عشقیہ شاعری پر حسن پرستی علمی۔ فلسفیانہ سماجی اور سیاسی دلچسپیوں نے بھی اپنے اثرات چھوڑے ہیں ان کے یہاں زندگی کی اعلیٰ و ارفع قدروں میں نیکی خلوص۔ ہمدردی شرافت انسانیت دوستی۔ علم پرستی اور حقیقی عظمت پرستی نے بھی تاثر چھوڑا ہے اشتراکیت سے پہلے کی شاعری میں سچی وطن پرستی۔ ہندوستان کی آزادی اور اس کے لئے جد وجہد۔ ہندوستانی عظمت اور اس قبیل کے سارے محرکات تصورات خیالات اور بدلتی ہوئی اقدار کارگر ہوتی رہی ہیں

۱۹۳۶ء کے بعد اشتراکیت اور اشتراکی فلسفے نے عشقیہ شعور اور عشقیہ شاعری کو جھنجھوڑ کر نئی وسعتوں اور نئی معنویت سے روشناس کرایا۔ ویسے تو پہلے بھی فراق کی شاعری حرارت کی ایسی چرما چاٹی سے تو محفوظ ہی ہی تھی۔ لیکن اس رجحان کے بعد فراق کی سمجھ میں آیا کہ محض جنسیت زدگی سستا اور روایتی عشق سچے عشق اور بڑی شاعری دونوں کو لے ڈوبے گی۔ قومی زندگی میں بیداری نے نئی توانائیوں اور نئے امکانات دیئے اور اب فراق کی تجربے اور مشاہدے کی تیز آنچ سے آمیز ہو کر عشقیہ شاعری صداقت سے آشنا ہوئی۔ اس شاعری میں جذبات کی لطیف اشاریت۔ رمزیت۔ کیفیت۔ ہمہ گیری۔ خارجیت۔ داخلیت اور بلندی آئی۔ معنویت تخلیق فضا۔ زبان بیان کا عالمگیر لہجہ۔ علمیت کی شان۔ انسان کے دل کی دھڑکنیں اور آفاقیت آئی۔ بلند پایہ اور بڑی شاعری اور قد آور شخصیت کوئی خلا میں نہیں پنپتی۔ یہ دوسروں کی دین ہے ہر شاعر کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے کہ اپنی شخصیت اور شاعری کے امکانات اور شعری وجدان کے لئے تہذیب انسانی سے کتنی بلندیاں اور عظمتیں اخذ کرتا ہے قدرت سے فراق کو علمیت خلا فانہ ذہن اور پرسوز دل کے ساتھ اخذ و جذب کی صلاحیت بھی ملی ہے۔ اسی لیے ان کی عشقیہ شاعری میں حیات و کائنات کی جھلکیاں ملتی ہیں اور زندگی کی پاکیزہ قدروں پر مکمل ایمان بھی۔ دکھ درد۔ آنسو۔ ہجر وصال اضطراب ناکامی

اور تکنیک بھی کچھ ہے لیکن شاعری میں بزاری کا احساس مفقود ہے۔ برخلاف اس کے عنصری کائنات کی طہارت۔ پاکیزگی اور شعریت کا براہ راست احساس ہوتا ہے۔ اظہار کے طریقہ کار اور انداز بیان میں ایک نیا آہنگ بھی محسوس ہوتا ہے اور مجازی دنیا کی پاکیزگی اور خیر و برکت کا ادراک کے ساتھ ساتھ متحرک جمالیات کا احساس بھی ملتا ہے۔

اردو شاعری پر بہت سے الزامات ہیں جن میں سے کچھ صحیح اور حقیقت پسندانہ بھی ہیں۔ جہاں جنسی زندگی کا عملی پہلو بوس و کنار۔ وصل و ہجر شکر و شکایت وفا جفا کا نامہ و پیام اور اسی نوع کی چند اور گھٹی بھر باتیں ہوں اور جو عشقیہ شاعری کا کل سرمایہ ٹھہریں (معدودے چند شاعروں کو چھوڑ کر جہاں فکر خیال میں جدت۔ طرز ادا میں ندرت اور جذبے میں شدت ہو) تو شاعر بیچارہ کیا کرے۔ ان کو کس کس طرح بیان کرے اسکے باوجود چند باتیں اور ان کی تکرار ایک ہی شخص سے ہزارہا اشعار کہلواتی ہیں۔ شاعر انہیں گنے چنے تجربوں اور خیالوں سے پورا دیوان کھڑا کر دیتا ہے جبکہ اگر نثر میں یہی تجربے قرطاس پر اتارے جائیں اور ان کو افسانوی تفصیلی اور تمثیلی رنگ نہ دیا جائے تو یہ چالیس پچاس صفحات سے آگے نہ بڑھیں گے۔ انگریزی ادبیات کے معتبر شاعر کیٹس نے اس بات کو اس مکڑی کی مثال دے کر واضح کیا ہے جو دو تین نقطوں سے جالا بننا شروع کرتی ہے اور ہزارہا حلقے بنا لیتی ہے یہ تکرار و تجدید

جذبہ عشق کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک بات ایک خیال اور ایک واردات ہزار ہزار جنم لیتی ہے اور پھر بھی اظہار کی گنجائش رہتی ہے اگر جذبہ عشق میں صداقت ہے اور محض روایتی تقلید پر مبنی نہیں ہے تو مجہول لذت پرستی دجو بری چیز ہے) بھی تخیل کی پہنائی وسعت اور ہمہ گیریت کی مدد سے خلاقانہ اہمیت وصلاحیت حاصل کر لیتی ہے جذبہ جب ادراک سے ٹکراتا ہے۔ تو اسکی بہت سی پرتیں کھلتی ہیں اور ان تہوں میں چھپی بہت سی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں۔ جن میں ذات کے تجربے کے باوجود آفاقیت نظر آتی ہے۔ اگر جنسیت اعتدال پر رہے تو اسے اعلیٰ عشق اور ارفع احساس حسن کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے اور پھر نا قابل اصلاح ہوسناکی اور ہوس کاری اور سستی چوما چاٹی بھی لطیف پاکیزہ رنگین متنوع اور بامعنی بن کر ادب وشاعری کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ کثافت ہی سے لطافت جنم لیتی ہے فراق نے اس سلسلہ میں چھان بین کے بعد اپنے لئے جو رنگ اپنایا ہے وہ تقلیدی نہیں ہے اس میں ان کا اپنا پن ہے انہوں نے استعارے، کنایے، رمز وایما اور اشاریت میں ایسا التزام رکھا ہے کہ معنی آفرینی قائم رکھتی ہے۔ تخیل کا دامن ضبط و توازن سے بندھا رہتا ہے جذبے کی شدت کا احساس ہوتا ہے اور شعریت مجروح نہیں ہوئی۔

ایسا جدید تمدن جو عریانیت پر زیادہ زور دیتا ہو۔ اس کا اوچھا پن فراق کے یہاں نہیں ہے فراق کی اعلیٰ شاعری کے وقت تک زندگی کی اعلیٰ قدروں کا

احترام باقی تھا۔ تہذیب کے منھ پر کالک نہیں لگی تھی انفرادی اور اجتماعی زندگی آج جس منزل پر ہے ایسی نہیں تھی۔ فرد کی شخصیت کو جھنجھلاہٹ جھلاہٹ الجھن بیزاری نے پوری طرح اپنی جکڑ بندی میں نہیں لیا تھا۔ دل عقیدت اور محبت سے خالی نہ تھے۔ تلون تشنگی۔ ناآسودگی۔ برہمی۔ سماجی ریاکاری۔ بے اعتباری اور انسانی ضمیر کے جرم نے ایسے قدم نہ جمائے تھے۔ جن کا زور آج بہت بڑھ گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ فراق عالمگیر انسانیت کی محبت کو قدر دل اور عقیدت کی بنیاد پر استوار کر سکے اور اسی لئے وہ اپنی شاعری میں انسانی زندگی کی ارفع اقدار اور فطرت کے حسن کو بحال کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری پڑھ کر ذہن اور شعور ماؤف نہیں ہوتے دل بیٹھتا نہیں بلکہ شاعری میں جمالیاتی خط اور تاثیر کا پہلو غالب نظر آتا ہے گردوپیش کی عکاسی کرتے ہوئے فراق نے اپنی تخیل کو اس طرح پروان چڑھایا ہے۔ اور مشاہدے سے وہ کام لیے ہیں کہ ان کی شاعری میں مستقبل کے لئے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔ اور ایسی تہہ داری بھی جو دوام حاصل کر سکتی ہے۔ انسانیت کی پیچیدہ اور الجھی ہوئی زندگی سے دلدادگی نے انہیں حقیقت کی مختلف جھلکیاں دکھانے پر مجبور کیا ہے ان کے یہاں زندگی دائمی حرکت اس کی بے کمالی ناتمامی کے پرتو کے ساتھ احساس حسن کا ادراک بھی ہے۔ انہیں اپنے وجود اور اس کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہر اچھے غزل گو کی طرح فراق کو بھی اپنے موضوع سے جذباتی تعلق

ہے۔ اس کے باوجود خارجی حقائق کو انہوں نے اپنی ذات میں اس طرح سمویا ہے جس سے مسرت اور بصیرت دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں کچھ قدروں اور علمیت اور شاعرانہ روایت کو اس طرح جذب کیا ہے کہ عین وحقیقت۔ فطرت اور آزادی۔ شعور اور لاشعور انفرادیت و اجتماعیت اور احساس و جذبہ۔ فکر و تخیل یکجا ہو گئے ہیں۔ زندگی کا ذکر کرتے وقت ان کے یہاں قدر کی کنجی سے زندگی کے سارے قفل کھلتے ہیں فراق کا شعر قدر کا خادم بھی ہے اور اس کا عکاس بھی ہے کہیں کہیں ان کی اندرونی ٹوٹن۔ بے مائگی اور افسردگی کی جھلک بھی کھاتی ہے۔

اپنے وجود کے شدید احساس سے انہیں کائنات و حیات کی صداقت اور کلیت کا احساس پیدا ہوا۔ تب ہی تو انہوں نے تخیل اور جذبے کے اندرونی تجربے میں خارجی حس اور مشاہدے کے تجربے سے شدت جدت اور صداقت پیدا کی۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی ایمائیت اور رمزیت میں عرفان ذات کے احساس کے ساتھ خارجی حقیقت کو سمونے میں کامیاب ہوئے ہیں انہوں نے دل کی داخلی حقیقت سے باہر کی ناتمام اور غیر مکمل کمیت کو ایک روپ دینے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے ان کی بیشتر اشعار میں انوکھاپن ہوا ہے ایک اپج کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔

حقیقی شاعرانہ وجدان وجود کے سچے علم اور اسے اچھی طرح سمجھنے سے حاصل

ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں فراق نے بڑی ریاضت کی ہے اور ذہانت سے بھی کام لیا ہے۔ تب ہی ان کا ادراک اس سچائی کا انکشاف کر پایا ہے کہ کائنات متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ اور اسی کو اساس بنا کر انہوں نے ماضی کے اس زندہ اور توانا پہلو سے جو حال و مستقبل میں اپنی ہیئت تبدیل کر کے قائم و دائم رہے گا جاندار روایتوں کی ہمیشہ رہنے والی روح کو لے کر اپنی شاعری میں محفوظ کر دیا ہے۔

غزلوں سے ہٹ کر ان کی نظموں میں بھی منظر نگاری اور تخلیق فضا کا سماں ہے آدھی رات پرچھائیاں رقص شباب اور داستان آدم وغیرہ ان کی ایسی نظمیں ہیں جو کسی حد تک غزلیت زدہ بھی نہیں ہیں اور جن میں گھلاوٹ اور پرسوز نغمگی کے ساتھ سنجیدگی بھی ہے فنی مبادیات سے روگردانی نہ کر کے اقبال کے خطوط پر انہوں نے نظم کی بنیاد رکھی ہے خیالات کی رو اور مقصد کی رسائی کا فرق ہے۔ فراق نے شاعری کے کلیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے فنی مبادیات سے روگردانی نہ کر کے اقبال کے خطوط پر نظم کی بنیاد رکھی ہے۔ خیالات کی رو اور مقصد کی رسائی کا فرق ہے۔ فراق شاعری کے کلیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی روایت کی زنجیروں کو توڑتے بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن حدود سے تجاوز کر کے وہ اس جدیدیت کے خلاف ہیں جس میں فن مجروح ہوتا نظر آئے۔ ان کی نظم ہماری تہذیب اور ہمارے قدیم ادب عالیہ

کی دین ہے فراق اچھی طرح جانتے ہیں کہ شاعری منوانے اور پہچانے کے لئے اپنا انفرادی رنگ و آہنگ بہت ضروری ہے۔ کمزور شاعری چاہے کتنی ہی رچائی جائے۔ کتنی رنگ آمیزی سے کام لیا جائے تراش خراش اور الفاظ کی بازی گری سے کتنی ہی سنواری جائے۔ خدوخال اور شخصیت سے محروم رہتی ہے فراق کی شاعری کو ان کی منفرد شخصیت اور علمیت کے علاوہ فن اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کے مرکزی جوہر یعنی حیات وکائنات کی عظمت۔ آفاقی وسعت۔ ان پر مکمل ایمان۔ بیکراں محبت نے عظمت بخشی ہے۔ دراصل ان کی شاعری جمالیاتی عظمت کی تلاش ہے۔ فراق کے یہاں ذہنی اور فکری تصورات کے ساتھ جذبے تخیل مشاہدے اور شعریت کی کارفرمائی ہے۔ زندگی اور اسکی حکمت کو نظر میں رکھ کر بدلتے حالات اور تبدیل ہوتی ہوئی اقدار کے ساتھ فراق بھی اپنے تجربوں اور شعری محاسن میں تبدیلی لائے ہیں اور جو عکس تخیل اور جذبے پر خارجی حالات نے ڈالا ہے اس کو فراق نے تسلیم کر کے موثر طور پر زندگی اور شعر کو فروغ اور ترقی یافتہ شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ فراق شاعری میں تمدنی زندگی کے ہر پہلو کو سمونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کا شعر زندگی اور فطری حسن کا آئینہ دار ہے۔ معاشی عمل کی اہمیت کو فراق نے بھی تسلیم کیا ہے لیکن حسن ادا سے شعریت کو برقرار رکھا ہے اگر فراق کی شاعری کو نفسیاتی سطح پر پرکھا جائے۔ تو جو شعور۔ مقصد اور ارادہ

ان کی شاعری میں کارفرما نظر آتا ہے وہ اخلاقی بصیرت کا ضامن ٹھہرتا ہے

لیکن فراق ان معنوں میں بڑے اور عظیم شاعر نہیں ہیں۔ جن معنوں میں غالب یا اقبال۔ وہ ان کی طرح عوام سے رشتہ رکھتے ہوئے کبھی اپنے معیار اور انداز فکر کو ان کی ذہنی سطح سے بلند رکھتے ہیں اس درجہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے ہیں غالب اور اقبال اپنے ماحول سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اس سے کس قدر بلند ہیں گرد و پیش کے اثر کے باوجود ان کے کلام میں ہمہ گیریت اور آفاقیت ہے۔ شاعر سماج سے بے تعلق رہ ہی نہیں سکتا۔ فرد کا جو تعلق سوسائٹی سے ہے اس کی کارفرمائی شعر میں ضرور آئے گی لیکن شاعر کو سماجی بندشوں۔ پابندیوں اور جکڑنوں میں باندھا نہیں جا سکتا۔ فراق کی شاعری سے جمالیاتی قدروں کے احساس کی وجہ سے ذہنی تسکین میسر آتی ہے۔ اور انسانی روح کی پیاس بجھتی نظر آتی ہے موسیقی اور صحافت کے درمیان سے راہ نکال کر فراق نے انسانی اعلیٰ قدروں کو فروغ دینے کی کامیاب سعی کی ہے۔ فراق نے شعور۔ وجدان اور عقل کے تعلق کو اور انسانی فطرت حسن اور ذہن کی سالمیت کو اپنے عمیق مشاہدے سے اندر اوپر اور باہر ہر سطح سے دیکھا پرکھا پڑتا اور سمجھا ہے۔ اور دروں بینی سے گریز کر کے اصلیت اور صداقت فکر اور جذبے کا تابع بنایا ہے اور شعریت کو ہر سطح پر نظر میں رکھا ہے انہیں احساس ہے کہ اعلیٰ درجے کے آرٹ میں خارجیت اور داخلیت

شعور اور تحت شعور۔ بیداری اور خواب میں فرق و امتیاز باقی نہیں رہتا۔ رمز و علامت اعجاز و ایجاز۔ لفظی تصویر کشی اور تحت الشعوری الجھنیں اور گتھیاں ان کے یہاں ایسی ہیں جو نئے پن کا احساس دلاتی ہیں۔ فراق نے شعر کے سارے عناصر کو اس طرح برتا ہے کہ اس میں معمے کی سی کیفیت نہیں پیدا ہوتی۔ اسلوب اور موضوع کی جدت کے ساتھ شعر کا راز شعریت میں ہے اور شعریت فکر اور جذبے کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے۔ فراق کے یہاں شاعری کے لامحدود امکانات۔ خواہشوں اور کاوشوں کا رنگ آرزوؤں کی صورت گری۔ حسن آفرینی اور قدر آفرینی بھی ہے اور ان کی فکر تخلیلی اور وجدانی بھی ہے جس میں اندرونی جذبہ خلوص اور رچاؤ ہے۔ اور اسی لئے ان کی شاعری کی اہمیت باقی رہے گی۔

اختر شیرانی کی رومانی شاعری

اختر شیرانی کی نظموں اور غزلوں کو پڑھنے کے بعد جو قدرتی سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں ان سے چھٹکارا پانا آسان کام نہیں ہے۔ جب دل کے بجائے عقل کی کارفرمائی ہو جائے۔ محض جذبے نے جہاں اپنی قدر کھو دی ہو وہاں ملکوتی حسن میں بھی زوال پسند ذہنیت کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے خواب سے اچھی بیداری معلوم ہوتی ہے۔ جذبے میں نشیب و فراز صداقت اور تفکر کی جستجو پریشان کرتی ہے۔ ذہنی افیون کی چاٹ سے زیادہ ذہنی تلوار کی کاٹ میں مزہ آتا ہے رومان میں حقیقت تلاش کی جاتی ہے۔ حسین اور سحر انگیں دھند لکے غاروں کی مہیب شکلیں اختیار کر جاتے ہیں جب اختر کی رومانی اور خاص دل کی شاعری کو ذہن کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے تو یہ شاعری وقتی

بے ہنگم اور بے وقت کی بے سری راگنی معلوم ہوتی ہے۔ اپنے زمانے میں چاہے اس نے جادوئی اثر دکھایا ہو۔ لیکن آج اس کی تاثیر میں کمی آچکی ہے۔ یہ شاعری اپنی عمر تمام کر چکی۔ اس کا حسن وقتی لمحاتی اور شباب کا یہ جذباتی جوش جلد زائل ہونے والا محسوس ہوتا ہے جس کا نشہ اترتے ہی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اور یہ ایک ایسا جادو لگتا ہے جو سر چڑھ کر نہیں بول پاتا اور پھر یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا اب شعروادب میں ایسی شاعری کی اپنی کوئی اہمیت ہے؟

یہ سب کچھ سہی۔ لیکن پاسبان عقل سے پیچھا چھڑا کر جب ہم دل کی آواز پر کان دھرتے ہیں۔ اور اس کی دھڑکنوں کو محسوس کر کے جب جذبات اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ تو کچھ دیر ہی کو سہی لیکن قاری اس شاعری سے مسحور ضرور ہو جاتا ہے۔

اختر کی شاعری میں شباب کی آوارہ نگہی ہے جو حسن کے بسیط تصور سے محروم ہے۔ تاہم اس میں فطرت کے ہر لمحے بدلتے ہوئے نظارے اور جلوے ہیں۔ زندگی اور اس کی یک طرفہ صداقت ہے۔ انقلابات تجربات اور رجحانات میں اختر کی اس ذہنی کمسنی اور جذباتی ہیجان میں شباب اور کیف ہے۔ جذبات کی تسکین تازگی۔ رنگینی اور نشاط وانبساط کا وہ سامان ہے جو احساس محرومی اور عرفان ذات کے اس دور میں مفقود ہے آج وقت کی بے رحم چکی نے نوجوانوں کے عزائم کو بھی پیس ڈالا ہے۔ نراجیت۔ تنہائی اور ذہنی تناؤ اور سماجی بحران اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ آج ہر فرد کے منہ کا مزا کڑوا ہے۔ ایسے میں اختر شیرانی کی شاعری کھل کر ہنسنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

وہ جا ہے لمحاتی ہی سہی ۔ اس میں رونا بسورنا نہیں ہے ۔ قنوطیت کا رنگ نہیں کے برابر ہے ۔ دل کا معاملہ کھلتا ہے اور یہی جادو انہیں زندہ بھی رکھے گا

اختر شیرانی نثار بھی تھے اور خوش فکر شاعر بھی ۔ بے ریا دوست بھی بے ضرر انسان بھی اور رند شاہد باز بھی ۔ افسوس یہ خوش فکر شاعر اپنی خوش بیانی حسین الفاظ کی میناکاری ۔ روایت پسندی اور فطرت نگاری کے لئے علیحدہ اور منفرد مقام اور شناخت نہ بنا سکا شاعری میں جب ان کے درجے کے تعین کی بات آئے گی تو دوسرے درجے کے شاعروں کی صف میں بھی بڑی مشکل سے ان کا نام آئے گا ۔

اختر شیرانی کا تعلق ایسے خاندان سے تھا جو اپنی ادبی، علمی اور تحقیقی خدمات کے لئے ہمیشہ سراہا جاتا رہے گا ۔ محمد داؤد خاں جو بعد میں اختر شیرانی بنے حافظ محمود خاں شیرانی (پنجاب میں اردو) کے مصنف کے صاحبزادے ہیں جو ۱۹۰۵ء میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد چونکہ اورنٹیل کالج لاہور میں پروفیسر تھے ۔ اس لئے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت لاہور کے مردم خیز شہر میں ہوئی ۔ ادبی و شعری ماحول ملا ۔ مناسبت شعری نے اس کو قبول کیا اور مشق سخن شروع ہو گئی ۔ ابتدا میں شاعری کے اسی فطری ذوق نے صابر علی خاں شاکر سے رجوع کیا ۔ اور اشعار ڈھلنے لگے ۔ طبیعت کی شوخی و رنگینی ۔ مناظر قدرت سے فطری اور دلی لگاؤ اور زندگی کی اعلیٰ اقدار یعنی ہمدردی خلوص اور شرافت نے شاعری میں سطحیت سے گریز کیا ۔ ادبی ورثے اور قدما کے دواوین کے مطالعے اور ذاتی مشاہدے نے مہمیز کا کام کیا ۔ اور پھر جذبات میں

عشق و محبت کی شدت نے کیف و ترنم اور شعریت سے روشناس کرا کے شاعری کی راہ پر لگا دیا۔

اختر شیرانی کی تمام شاعری کی اساس افسانہ ہائے عشق و ہوس پر قائم ہے۔ عورت ان کے اعصاب پر سوار ہے۔ عورت زندگی (جو زیادہ تر ذہنی ہے) تخیل کی رنگینی، حسن ادا اور لطیف موسیقیت کی آمیزش نے ان کی شاعری کو خوش گوار اور کیف زا بنایا ہے۔ سچی حسن پرستی اور نفاست طبع نے کلام کو جذباتی صداقت سے آشنا کرایا ہے۔ بے حیائی اور پستی بوالہوسی سے کلام کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ اگر اختر کی زندگی نے کچھ اور زیادہ وفا کی ہوتی۔ تو وہ محبت سے دنیا کو معمور کر دیتے۔ انہوں نے بے رحم زمانے اور بے درد اور ظالم عزیزوں اور رشتے داروں سے بھری اس پاپ کی بستی اس نفرت گھر عالم اور اس لعنت گاہ ہستی کو ۱۹۴۸ء میں صرف ۴۳ سال کی عمر میں چھوڑا اور اس خواب نما روشن اور مہتاب نما دنیا میں چلے گئے۔ جو زندگی بھر ان کی آنکھوں تلے پھرتی رہی۔ جو کچھ انہیں محبت نے دیا تھا۔ اس کو بھی تڑپ دے کر اور خون جگر سے سینچ کر اشعار کے پیکروں میں ڈھال دیا اور پھر ایک بحر کیف اور ترنم شعریت کے ساتھ ہم تک پہنچا دیا۔ جس کا سب کچھ روایتی ہی نہیں ہے۔ ان کا اپنا بھی کچھ ضرور ہے۔

نظم کے شاعروں میں اختر شیرانی رومانوی انداز کے شاعر ہیں جن کی نظموں میں نشہ کی سی سرشاری ہے یہ نظمیں جذبات کی شدت سے مملو ہیں۔ اور کچھ دیر ہی کو سہی کسی اور دنیا میں پہنچا کر عجیب سی لذت سے ہم کنار کراتی ہیں۔

لیکن ان میں زمین سے ۳۳ فٹ بلند ہو کر ایک تصوراتی دنیا کی ایسری ہے مثال کے طور پر سلمیٰ ہی کو لیجئے۔ یہ آسمانی مخلوق سے لگا کھاتی ہے اگر یہ گوشت پوست کی زندہ مخلوق نہ ہوتی تو اس میں کیفی اور کافور کی بو آتی۔ اگر ان کی نظموں کو بھرپور شباب کے دنوں میں پڑھئے۔ تو اس تصوراتی عورت کا فوٹو آنکھوں میں لبا کر اور سینے سے لگا کر مر جانے کو جی چاہے گا۔

نغمہ وحرم۔ اخترستان اور لالہ طور میں اخترستان کی نظمیں نمائندہ اور بڑی حد تک بھرپور تاثر کی حامل ہیں۔ نغمۂ حرم میں دیہاتی لڑکی کا گیت دیکھو وہ جوگن جنگل میں گا رہی ہے۔ عورت۔ کلوپیٹرا۔ تاروں کی بستی رومانی نظمیں ہیں۔ جو غزلیت زدہ ہیں۔ او دیس سے آنے والے بتا۔ جہاں ریحانہ رہتی تھی۔ ایک حادثہ۔ سرزمین عشق۔ سلمیٰ۔ وادی لنکا میں ایک رات انتظار۔ چودھویں سالگرہ کا تحفہ۔ ایک تصویر دیکھ کر ایک نوجوان بت تراش کی آرزو۔ تاثرات نغمہ۔ دنیا کی بہاریں۔ اختر کی زندہ رہنے والی جاندار نظمیں ہیں۔ جن میں ان کا جوان چنچل۔ شوخ اور مضطرب عشق اپنی انتہا پر ہے۔ جو حسن کا دالا و شیدا اور پرستار ہے۔ اس کی خاطر عاشق موت سے ہم کنار ہونے کو معراج سمجھتا ہے۔ اور اس نعمت پر سب کچھ نثار کر دینے کو تیار ہے یہاں وہ شدید جذبہ ہے جسے انسانی کمزوری کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی چڑھتی جوانی کا وہ طوفاں جو سارا خس و خاشاک بہا کر لے جانا چاہتا ہے۔ خوابوں۔ آرزوؤں تمناؤں اور جذبات کی وہ یورش اور شورش ہے جس سے دنیا کی آبرو اور اسکا بھرم قائم و دائم ہے۔ یعنی اختر کی شاعری عنفوان شباب کی وہ شاعری

ہے جس پر عشق چھایا ہوا ہے۔ اور تصوراتی عورت کا حسن اور اس کی متنوع ادائیں سیزان ہے عشق میں جذبہ اور اس کی شدت ہے۔ خون اور اس کی گرمی و سرخی ہے۔ شراب کی سی تیزی۔ اور خمار ہے اور حسن میں جادو دھندلکا اور خوابوں کا تانا بانا ہے۔ فکر کو قطعی دخل نہیں ہے اور اس میں عقل کی روشنی۔ گیرائی اور اور گہرائی اور استواری آجاتی   تو اسکا سارا فطری پن ختم ہو جاتا۔ اس کا تاثر لمحاتی ہے۔ جس کا لطف ایک خاص وقت اور ایک عمر کے ایک مخصوص حصہ میں ہی اٹھایا جاسکتا ہے۔ ان کے عشق کی معصومیت فطری رنگ بے ساختگی اور رنگینی ان لمحات کو روشن بناتی ہے۔ اور کہیں زندگی سے گریز اور فرار کی راہ نہیں سجھاتی۔ فریب ہستی کی آگہی سے پہلے ایک دور ہر ہی ضرور آتا ہے۔ جس سے ہر کس و ناکس دوچار ہوتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو شباب کے بدلے سوت آتی ہے۔ فریب تو بہت بعد میں کھلتا ہے۔ اور تب آدمی پلٹتا ہے اور پھر یہ کہیں تو زندگی سے بیزاری کی شکل میں اور کہیں بے چین آرزو کی کارفرمائی کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اور کہیں زندگی عالم حسرت ہی میں دم توڑ دیتی ہے۔ اختر بھی آسمان سے زمین پر اتر رہے ہیں۔ جب زندگی کا فریب کھلا اور انہیں ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا تو ساری شگفتگی زندہ دلی اور خوش وقتی ہوا ہو گئی۔ اور خوابوں سے حقیقت کی طرف واپس آنے پر فریب ہستی نے انہیں یہ درس دیا۔

حسن تو کچھ بھی نہیں عشق جواں کچھ بھی نہیں
ہوش اے دل کہ جہاں گزراں کچھ بھی نہیں

اور اب سنہرے دھندلکوں اور جادو کے پُر اسرار جزیروں میں خونِ آرزو کی دھاریاں نظر آتی ہیں اب افسانے پر حقیقت کی تہہ چڑھ گئی ہے بیان میں شعلوں کی لپک اور زبان میں تلوار کی سی کاٹ آگئی ہے لیکن اسمیں نہ تلخی ہے اور نہ زہرناکی۔ کلبیت۔ دنیا سے بیزاری اور فرار کا پہلو نہیں ہے برخلاف اسکے وہ بزم عیش کے حقیقی تصور کو اپنے کلام میں جگہ دے کر نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ نئی محفل آراستہ کرتے ہیں۔ جس میں ذہنی بچپن جوانی کی سرحد پار کر کے اپنی عمر کو پہنچتا نظر آتا ہے۔

منتظر عالم نو کا ہے جہاں کہنہ
شب تیرہ سے عیاں صبح درخشاں کر دیں

ان کے کلام دوسرا مجموعہ لالہ طور ہے۔ جہاں اختلاطی رنگ کا غلبہ نظر آتا ہے۔ آرزوؤں پر اوس سی پڑ گئی ہے۔ وجد و کیف پر زیادہ زور ہے۔ داستان حیات۔ نغمہ بہار۔ نخفا قاصد۔ سیر اسو جودہ مشغلہ وغیرہ نظموں میں عشق کا جوش دم توڑتا نظر آتا ہے۔

دنیا کی ساری خوشنمائی عورت ہی کے دم سے سہی۔ وہ اختر کی پوری شاعری پر چھائی ہوئی بھی ہے لیکن اس کا سراپا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ تصوراتی عورت جو ملکوتی حسن کی مالک ہے۔ دراصل اختر کا جمال ذہنی ہے یہ شاعر کے دل کی آورش ملکہ ہے۔ جس کا وجود نہیں۔ جو صرف پیکر مہتاب ہے۔ یا بہار حسن کا غنچہ شاداب۔ یا پھر مقدس پرچھائیں اور سراپائے خیال حور ہے۔

تری صورت سراپا پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ

یا

یہ مستانہ نگاہیں اک بہشتی خواب کا عالم

اختر نے جو تصویریں بنائی ہیں۔ وہ جاذبِ نگاہ ہیں، حسین و دلکش ہیں۔ ان کے رنگوں میں شوخی بھی ہے۔ ان میں احساس کی شدت کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ اور شاعری کا شعری خلوص بھی۔ تاہم یہ تصویریں واضح خدوخال سے محروم ہیں۔ ان پیکروں میں وہ تڑپ نہیں جو فن کی معراج ہے خلوص اور صداقت پر ایک سنہرا نقاب پڑا ہوا ہے جس سے نگاہیں دھوکہ تو کھاتی ہیں۔ لیکن جلد چوندھیا کر کسی اور چیز کی متلاشی ہوتی ہیں۔ ایک ایسی چیز جو ذہن کو جھنجھوڑ دے۔ یہاں فکر کے پر جلتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اختر سے پہلے عورت کا اس جوش اور جذبے کے ساتھ یوں کھل کر کسی نے نام نہ لیا تھا۔ اختر کی عورت کی صفات اس دنیا کی گوشت و پوست کی عورت سے بالکل مختلف ہیں۔ اس کے پاس دل بھی ہے۔ لطیف جذبات بھی ہیں جو تاثر بھی قبول کرتی ہے۔ اور اظہار کا اثر بھی لیتی ہے لیکن وہ ہے محض جنت ارضی کا خواب۔

یوں تو روایتی عشق اردو شاعری پر ابتدا ہی سے چھایا ہوا ہے۔ لیکن وہاں عورت کے بارے میں صرف بلیغ اشارے ہیں۔ محبوبہ کی نفسیات، عشق کا چلن اور واردات۔ جوان راتوں اور پرکیف شاموں کا بیان جیسا

اختر نے کیا ہے اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا۔ اختر کے عشق پر فطرت بھی مسکراتی ہوگی ؎

ایسے پھولوں نے تیری یاد میں بے تاب دیکھا ہے
ستاروں کی نظر نے رات بھر بے خواب دیکھا ہے
وہ شمع حسن تھی پر صورتِ پروانہ رہتی تھی۔

اختر کی شاعری میں مایوسی۔ حزن حرماں نصیبی۔ پامالی۔ بے ثباتیٔ دنیا اور تخریب کا شائبہ تک نہیں ہے ان کی محبوبہ کے مشرقی حسن میں چاہے جانے کی لذت ہے۔ عشق کے بارے میں احساس گناہ شرمندگی و پشیمانی کا جو پرتو قدیم شعرا پر چھایا ہوا تھا۔ اس سے ان کی شاعری پاک ہے۔ ان کے یہاں اسکا بیان نہ گناہ ہے اور نہ قابل ملامت اور مخرب اخلاق۔ اختر نے عشق کے ڈانڈے عبادت سے ملا دیئے ہیں جس میں ایک حسین جسم کی تلاش اور لاگ ہے۔ جسم کی مستی ایک پرکیف لذتیت رکھتی ہے اختر نے اس مستی کا جواز اخلاق کے بجائے انسانی فطرت میں ڈھونڈا ہے۔ انہوں نے شعروادب سے ذہنی خشکی دور کر کے احساسات کو تری بخشی ہے اور اس جنسی کیفیات کی رنگینی کے بیان سے شعری دنیا کو وہ آبدار سوتی دیئے ہیں جس کا تصور بھی قدما نہ کر سکتے تھے اختر کے یہاں اس جسمانی محبت میں لذتیت کے باوجود عریانیت۔ پستی۔ ابتذال اور بازاری پن نہیں ہے۔ انہوں نے جنسیات میں جذبات کی گہرائی اور شدت پر زور دیا ہے۔ انکار سے کنی کاٹی ہے۔ اور اسی لئے اختر کی شاعری عظیم عشقیہ شاعری نہیں بن سکی۔ کیونکہ اسمیں

خیالات کی وہ بلندی۔ تخیل کی ندرت اور وہ آفاقی رنگ نہیں ہے جو اسے لازوال بناتے ہیں۔ اختر کی عشقیہ شاعری میں تفکر کی دھیمی یا تیز آنچ کی جستجو بے معنی ہے یہاں تو خالصاً جذبات میں شوق۔ حسن اور اسکے اثرات کا بیان ہے

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے خدائی کی حسین معلوم ہوتی ہے

اختر کے اس قسم کے اشعار میں شاعرانہ رنگ کے ساتھ ساتھ جذباتی کیفیت کا بیان ہے۔ والہانہ پن اور خود سپردگی والی کیفیت نے اسکو چمک دمک عطا کی ہے

اس کے عہد شباب میں جینا
جینے والو تمہیں ہوا کیا ہے

یہ مے چھلک کے بھی اس حسن کو پہنچ نہ سکی
یہ پھول کھل کے بھی اس کا شباب ہو نہ سکا

مجھے میخانہ تھراتا ہوا محسوس ہوتا ہے
وہ میرے سامنے شرما کے جب پیمانہ رکھتے ہیں

سچی بات یہ ہے کہ اختر غزل کے نہیں نظم کے شاعر ہیں۔ غزل کا رمز وایما۔ بلاغت۔ شعریت حسن ادا اور نکتہ آفرینی ان کے حصہ میں ممتاز غزلگو شعرا جیسی نہیں آئی تھی تاہم ان کی غزلیں فطرت نگاری اور جذبات نگاری میں اپنے اندر شگفتگی رکھتی ہیں۔ ان کی نظموں میں غزلوں کے مقابلے میں زیادہ سوزونیت اور موسیقیت ہے۔ رنگ زیادہ شوخ وشنگ ہیں۔ نوجوان عشق سطحی ہونے کے باوجود صحت مند ہے۔ ان کی خیالی جنت (Utopia)

میں فطرت کے حسن کی جھلکیاں ۔ پنگھٹ ۔ چھوٹے دلچسپ اندھیاریاں ۔ پہاڑ اور اس کے گرد دریا ۔ حسین زندگی کی روانی اور مسلسل حرکت ۔ تقدس اور عظمت کے احساسات کو ظاہر کرتے ہیں وہ طبعاً فطرت پسند ہیں یہ فطرت کے مصور بھی ہیں اور اسکی بے مہری کے شاکی بھی ۔

ان کے یہاں ۔ عورت ۔ ماضی اور فطرت کی مصوری میں تصور کی رعنائی پنہائیاں ہیں ۔ یادوں کے سارے فانوس روشن ہیں ۔ رنگوں ۔ سمتوں اور خطوں کی ساری بہاریں پوشیدہ ہیں ۔ ان فردوسی مناظر میں دورویہ قطاروں میں کہیں حسن و مسرت کو اپنے اندر جذب کرنے کی آرزو اور کہیں گریز فراریت کی تمنا کروٹ لے رہی ہے ۔

ایک بات جو توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ اختر کے یہاں محبوب کی تمنا اور لہو کی رنگینی دونوں کا بیان ہے ۔ اس میں تضاد کا پہلو نکالنے کے بجائے اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ان کی طرف واپسی کرنا پڑے گی وہ ماحول جس میں اختر نغمہ سرا تھے وطن کو آزاد کرانے کی جدوجہد کا ماحول ہے ۔ ماحول سے اختر نے آنکھ نہیں چرائی ہے اگر وہ سلمیٰ کی تصویر کو سینے سے لگا کر اس کی آرتی اتارنا مقدس فریضہ سمجھتے تھے تو دوسری طرف وطن کی آزادی کی خاطر زخموں سے کھیل جانا اور لہولہو ہوکر وطن پر نثار ہونا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں ۔ ان کے اس سیاہیانہ عشق میں تیزی اور شدت کے باوجود سطحیت ہے لیکن ہم ان کے فنی شعور کی پختگی کا پتہ چلتا ہے ۔ خیال انگیز تشبیہات و استعارات سے انہوں نے اپنی نظموں کی روانی اور دلکشی بڑھانے کا کام لیا ہے ۔

شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی ساری فضائیں ہیں
افق پر سوجزن ستارہ خوابوں کی ہوائیں ہیں

اس فنکاری نے شعری فضا کو رنگین بنایا ہے۔ اور سارے ماحول کو سنہرے پردوں میں ملفوف کر دیا ہے۔

تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے۔ یہ اور ایسی بہت سی جذباتی کیفیتیں دیکھ کر قاری کا ذہن رنگین دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ جادو کے دروازوں سے گزرنے میں اسے بڑا لطف و سرور آتا ہے۔ خیال اس کیف آگیں ماحول میں بھٹکا سا جاتا ہے۔ لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد جب وہ اس رنگین دنیا سے پلٹتا ہے تو سارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے خواب بکھر جاتے ہیں۔ آرزوئیں پشیماں نظر آتی ہیں اور وہ اختر کی سطحی اور یک رخی رومانیت کو رد کر دیتا ہے۔

الطاف حسین حالی

حالی ایک پیر نابالغ ہیں ۔ یہ رسمی اور روایتی نیکیوں کا خیال رکھتے ہیں اسی لئے اپنی کمزوریوں کے افشا سے ڈرتے ہیں ۔ اپنی کمزوریوں اور خامیوں سے وہی لطف اندوز ہو سکتا ہے ۔ اپنے اوپر وہی بے محابا قہقہے لگا سکتا ہے جو نادان اور معصوم بچوں کی طرح نہ صرف یہ کہ اپنے اوپر اعتماد رکھتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی قابل بھروسہ تصور کرتا ہے ۔ پیر نابالغ میں کوئی ایسی کشش اور جاذبیت نہیں ہوتی جو تضاد کو آہنگ سے اور کشمکش کو آسودگی سے ہم کنار کر سکے ۔ پیر نابالغ تو انسان کو مجمع میں   دیکھنا چاہتا ہے اور   کھاتا ہے ۔ رات کی تنہائی میں بے تکلف دوستوں اور شہر کے تنگ اور طلسماتی کوچوں میں نہ وہ خود نظر آتا ہے اور نہ دوسروں کو دیکھنا پسند کرتا ہے وہ انسانوں سے واجبی احمدردی کا محبت کرتا ہے ۔ اندر سے وہ مردم بیزار ہوتا ہے ۔ اس میں انسان دوستی کا تصور

عالمگیر نہیں ہوتا۔ اگر اس سے کسی کی سوانح عمری لکھنے کو کہا جائے تو اسکی نظر انتخاب قرۃ العین حیدر پر نہ پڑکر حضرت مریم پر پڑے گی جن کی تقدیس ایک مسلمہ حقیقت ہے حالی نے انہی لئے سعدی اور غالب کا انتخاب کیا تھا انکے دماغ اور ذہن میں روح و بدن کا تصور تو ہے لیکن گنجلک۔ پیچیدہ مبہم اور الجھا ہوا۔ یہ بدن کے مظاہر کو روح کے مظاہر سے بے تعلق سمجھتے ہیں جدیا کاری کو اخلاق کا جز سمجھتا ہے اور اپنے اصلی فطری رنگ کو بھدے اور بھونڈے طریقے سے مصنوعی غازے کا سہارا لے کر چھپانا چاہے اور خود کو اور دوسروں کو فریب مبتلا کر کے خوش فہمی کے دامن سے چمٹا رہے وہ پیرِ نابالغ ہے۔ حالی میں بھی یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں۔ جدید دور کا شاعر رجعت پسند اور قنوطی کے درمیان کی وہ شے ہے۔ جو صداقت کا سواگت کرتا ہے۔ حقیقت کو زہر سمجھ کر اس سے کنی نہیں کاٹتا۔ خوشیاں اسے بھی پیاری ہیں۔ لیکن ایک معقول حد تک وہ غموں کو سینے سے لگا کر زندگی سے لطف اندوز ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے قول محال میں ہرجستگی ہے۔ وہ اک ایسا جواری ہے جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر ہارنے کے باوجود بھرپور زندگی گزارتا ہے شکست نہیں مانتا۔ بلکہ اس پر خوش دلی سے فتح حاصل کرتا ہے جو قدیم و جدید اقدار میں توازن برقرار رکھتا ہے۔ جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہنے سے گریز کرتا ہے وہ جدید کے ساتھ قدیم معاشرت کا بھی دلدادہ ہے۔ ایمان میں اس کے لئے دلکشی ہے۔ لیکن کی کفر کی تقاضیت بھی اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ وہ عمل کرتا ہے لیکن سہل انگاری کو بھی عزیز

رکھتا ہے۔ اسے اپنے نفس پر اختیار ہے وہ اسکا احترام بھی کرتا ہے لیکن اسی نفس کی بدولت وہ کبھی کبھی بے اختیار بھی ہو جاتا ہے وہ نیکیوں کو نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے لیکن بدی بھی اسے اس لئے عزیز ہے کہ یہ نیکی کی بگڑی ہوئی شکل ہے وہ نشہ بھی کرتا ہے سرور کی خاطر نہیں بلکہ ماضی کے اس المیہ اور اس کے کرب کو پوشیدہ رکھنے کی خاطر جس سے معاشرہ دوچار ہو گیا تھا۔ لیکن اگر آپ بہکے ہوئے ہوں تو ایسی حالت میں وہ آپ کی رفاقت کر سکتا ہے اگر یہ ایک طرف اپنے اوپر طنز پر ہنسی ہنس سکتا ہے تو دوسری طرف اس کے طنز و مزاح کا نشانہ بن کر آپ بھی زد میں آ سکتے ہیں۔ اسے اپنے ماحول سے محبت ہے وہ ماحول پر حکمرانی کرنا چاہتا ہے۔ اس سے شاکی بھی ہے۔ تشکیک جب اپنا سر اٹھاتی ہے تو وہ بیزار نظر آتا ہے۔ وہ حیاتی قدروں کا احترام بھی کرتا ہے ان سے گریز بھی کرتا ہے اور ان کو جھٹلاتا بھی ہے۔ وہ بظاہر نامعقولیت پر اتراتا ہے لیکن آپ کی نامعقولیت برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ بزدل ہے لیکن ہمت اور جوانمردی سے یکسر عاری بھی نہیں ہے۔ یہ سب واقعات اور حالات پر منحصر ہے وہ چور نہیں ہے لیکن کبھی کبھی ادھر ادھر ہاتھ مارنے کو برا نہیں سمجھتا۔ زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہے۔ ہر راہ سے گزرا ہے لیکن صراط مستقیم کے بجائے اسے پُر پیچ راہیں پسند ہیں۔ اس کے سوچنے کا انداز ٹیڑھا ہے۔ اس لئے کہ سماج ٹیڑھا ہے۔ صنعتی تہذیب اور مشینی دور نے اسے بوکھلا دیا ہے۔ وہ محو حیرت ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

اس کی نظریں خیرہ ہیں وہ اک ایسی شے کا متلاشی ہے جو اسے سکون دے سکے ۔ ذہنی اور روحانی آسودگی بخش سکے وہ شاید ان جنگوں سے نجات چاہتا ہے جنہیں بڑی اور اونچی ناک والوں نے اپنی ناک کو اور بڑا اور اونچا رکھنے کی غرض سے دنیا پر مسلط کر رکھی ہیں سورڈ آف ڈیموکل کی طرح وہ سرمایہ داری کے منہ پر زناٹے دار تھپیڑ مارنا چاہتا ہے لیکن جو بھرپور طمانچہ زمانے نے اس کے منہ پر مارا ہے وہ اس کی تاب نہیں لا پا رہا ہے یہ جب بگڑا ہے تو معاشرے کا آسیب بن گیا ہے اور جب سنبھلا ہے تو اقبال بن گیا ہے ۔ حالی اس سب سے بے نیاز ہیں ۔

پیرنابالغ ایسے بالغ کو کہتے ہیں جو بلوغت کی حسرت میں اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے ۔ ان پیر بالغاں کا احاطہ کرنا مشکل ہے ۔ اس وقت ہمیں صرف حالی ایسے پیرنابالغ سے ملاقات مقصود ہے ۔ حالی کو اگر غالب مشورہ نہ دیتے تو شاید شعر بھی نہ کہتے ۔ غالب کے مشورہ مان کر اور شیفتہ کے مہمیز لگانے پر نہ جانے کیوں انہوں نے اپنی طبیعت پر جبر کیا اور شاعری شروع کر دی ۔ فطری جبلت اور عذر حالی کے لئے دو نفسیاتی سانحے بن گئے اور نتیجہ میں حالی رہی سہی رجائیت بھی کھو بیٹھے ۔ اور زندگی کی ساری خوشیوں سے محروم ہو گئے ۔ انہیں شباب کے بدلے موت آئی حالی کے لب سدا مسکراہٹ کے لئے ترستے رہے ۔ زندگی کی کم مائگی اور بے مائگی کے احساس نے ۔ معاشرے اور قوم کے درد نے حالی کو حواس کی لذت سے بیگانہ کر دیا ۔ شیفتہ اگر حالی کو صداقت کی تلقین نہ کرتے

تو شاید یہ مسدس کہنے پر بھی آمادہ نہ ہوتے۔ مسدس تو وجود میں آگئی۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اگر یہ نہ ہوتی تو اقبال کو اپنی راہ کو متعین کرنے میں کچھ دشواری ہوتی۔ حالی کے قوم کے نام اس مرثیہ میں نہ حسین دیوانگی ہے اور نہ لاشعور کی وہ موسیقیت ہے جسے زندگی سے تعبیر کیا جا سکے۔ ماضی کا رونا رو کر اور قوم اور معاشرے پر آنسو بہا کر انہوں نے اپنے آپ سے تو وفا کی اور اسی وفا کے سہارے وہ زندہ بھی ہیں۔ لیکن اردو شعری دنیا کو اقبال جیسا کوئی کارنامہ نہ دے سکے۔ حالی کی مسکراہٹ اگر کہیں ہے بھی تو بھی صرف مانگنے کی روایت سے چھٹی ہوئی ہے حالی کے نزدیک زیرِ لب تبسم کی شان محبوبی اور کھل کر مسکرانا خدا اور بندے دونوں کی توہین ہے۔ زندگی سے حظ اٹھانا حالی کی خود ساختہ شریعت میں کفر ہے۔ حالی کی مستعار مسکراہٹ میں جو خود ان کے اوپر بھرپور طنز ہے نہ چمن کی سی رنگینی ہے اور نہ سرخ و تازہ خون کی سی گرمی۔ حالی کے یہاں زندگی حسن و توانائی سے محروم ہے جب حالی کو اک ذرا رونے سے فرصت ملتی ہے تو انہیں زندگی کے فریضے یاد آجاتے ہیں جن کی ادائیگی میں خوف درقت تو ہے لیکن وہ اصول اور لذت سے محروم ہیں جو شخص حسن الفاظ کو بھی گناہ سمجھے اس کے خواب و خیال میں بھی پاکیزہ لذتیت اور معتدل ہیجان کی بات نہیں آسکتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس جذبے نے اور ان کے شعور کا وہ کون سا گوشہ ہے جنہوں نے ان سے کچھ اچھی غزلیں کہلوالیں۔ جو دل کو چھو لیتی ہیں اور غزل کے معیار پر بھی پوری اترتی ہیں ان غزلوں پہ شک و شبہ کی گنجائش ہے

تشکیک سر ابھارتی ہے۔ دل میں وسوسے اٹھتے ہیں اور دماغ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ یہ حالی کیسے ہو سکتے ہیں؟

حالی جن کے نزدیک زندگی فرائض کے تسلسل کا نام ہو جو عورت کو کھلونا محض سمجھتا ہو۔ حالی کے نقطہ نظر کے مطابق عورت عصمت پروری کا مجسمہ ہے اور وہ صرف خاوند کی اطاعت اور بچے پیدا کرنا جیسے فرائض کی انجام دہی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یعنی حالی کی پیش کردہ عورت ماں۔ بہو اور بیٹی تو بن سکتی ہے۔ نہیں بن سکتی تو محبوبہ۔ جس کے خیال کے مطابق بازار میں ایسے چلا جائے کہ نظریں نیچی رہیں اور اگر بھولے بھٹکے نگاہوں کے سامنے بجلی سی کوند جائے یا کوئی شعلہ سا لپک جائے۔ تو توبہ استغفار اور لاحول عین بندگی ہے۔ چاندنی کا مصرف حالی کے یہاں صرف یہ ہے کہ اس میں قضائے عمری ادا کی جائے۔ جو حسن کے احساس سے محروم ہو جو روزانہ کے میلانات میں ایک قسم کا کاروباری میلان رکھتا ہو جس کے یہاں صرف چند بے جان اصولوں کی کارفرمائی ہو۔ جہاں نیکیوں کا محدود تصور ہو وہاں کیا توقع کی جاسکتی ہے حالی کی نیکیاں خوفناک سازشیں ہیں جو مستی اور سرشاری سے تہی ہیں۔ جن میں ارادے کو دخل ہے۔ جو انعام کی خواہاں ہیں جن میں برکتوں کا احساس ہے اور جن کے لئے ہمیشہ روحانی عذاب میں مبتلا رہنا از حد ضروری ہے ان نیکیوں سے جو نجات کا وسیلہ ہوں اور بالارادہ کی جائیں وہ نیکیاں بدرجہا بہتر ہیں خوخون سے ازخود ابلیں جو دائمی لذت کا وسیلہ ہوں اور غیر شعوری طور پر سرزد ہو جائیں۔ حالی کی ان نیکیوں میں

تشکر کا احساس۔ زندگی کی بے کرانی اور خضر و مسیح سے ہٹ کر دہ گمراہی نہیں ہے۔ جور و جاہیت کی جان ہوتی ہے۔ حالی کی نیکیوں میں بھی روایت کا منجمد اور نیلا خون ہے زندگی سے ایک محدود حد تک نباہ کی صلاحیت لئے ہوئے حالی شاید ناواقف ہیں کہ دنیا میں بے شمار رنگ ہیں۔ دنیا ایک بھی ہے اور بوقلموں بھی لیکن ان رنگوں کے امتزاج اور آمیزش میں اک ستم ظریفی ہے۔

ان سب باتوں کا اثر حالی کی انشا و ادب پر بھی پڑا ہے۔ ان کا اسلوب اسی لئے سپاٹ۔ بے مزہ اور پھیکا ہے۔ حالی کے یہاں ظرافت اور مزاح کی افسوس ناک حد تک کمی ہے۔ رجائیت اور توانائی کے فقدان نے حالی کے شعری کارناموں میں بھی یکسانیت پیدا کر دی ہے حالی نے ہماری اردو تنقید کو صوری اور اسلوبی تنقید کے تنگ حصاروں سے نکالا ضرور ہے۔ لیکن ان کی معلومات کا دائرہ محدود تھا۔ وہ مغربی ادب سے زیادہ استفادہ نہ کر سکے۔ بقول صالحہ عابد حسین "مقدمہ حالی کی سب سے زیادہ مشہور سب سے زیادہ معتوب اور سب سے زیادہ مقبول کتاب ثابت ہوئی" حالی نے تنقید میں اجتہادی شان کو برقرار رکھا ہے۔ لیکن حالی سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ملٹن کے مبینہ اصولوں کو تنقید شعر کے بنیادی اصول سمجھ لیا۔ لیکن حالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شعر کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا۔ وہ ذہن کو شعر کی عظمت کی طرف منتقل کرتے نظر آتے ہیں وہ اپنے ہم عصر آزاد کے اس قول سے سو فی صد متفق نظر آتے ہیں

"تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو۔ نہیں تو تمہاری اولاد ایسا پائے دشمی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو گئی۔"

افسوس اس بات کا ہے کہ حالی زبان کے سلسلے میں کوئی تعمیری اور منظم تجویز نہ پیش کر سکے۔

خاموش انکسار اور بے لاگ ایثار ہر ضرورت سے زیادہ زور دینے والا یہ پیر نابالغ بوڑھا پیدا ہوا تھا۔ جس کے یہاں جذبات کی برانگیختگی۔ عورتوں کا حسن۔ موسیقی اور مصوری شجر ممنوعہ ہیں۔ وہ مشرق اور مغرب کے ملاپ کا خواہاں تو ہے لیکن جب کسی فرنگن کے واٹر سلک کے گوان پر نظر پڑ جاتی ہے تو فوراً مشرقی گرنٹ کا پاجامہ یاد آ جاتا ہے اور پھر لاحول پڑھ کر یہ اپنی توجہ دوسری طرف کر لیتے ہیں انگریزی کے نام ہی سے حالی کو لرزہ آتا تھا۔ ان کا مغربی ادب کا سارا مطالعہ ترجموں کا رہین منت ہے ان کی مجبوری اور کمزوری تھے سرسید۔ سرسید کی حدود میں رہ کر سرسید کی ہر بات کو حدیث اور آیت سمجھنے والا یہ پیر نابالغ اسی لئے شبلی کی نظر میں ایک محترم خاتون سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے جرأت رندانہ اور قوت عمل سے محروم حالی کے شعور میں تیزی اور وہ چونکا دینے والی بات کہاں سے آتی جو صرف عمل جراحی سے پیدا ہوتی ہے یہاں تو تجربے پر منطق کو ترجیح دی جاتی ہے۔ حالی کے ہاتھ میں بہار بھی آ کر خزاں بن جاتی ہے باوجود صفائے قلب حالی جس سے محروم ہیں وہ مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے

کے بعد اپنی روایتی قوم کی مغفرت کی دعائیں تجارت کے اصول پر مانگتے ہیں۔ انہیں ماضی سے بے پناہ پیار تھا۔ لیکن وہ سچے علم سے بیگانہ تھے۔ گناہ و ثواب۔ آگ و پانی اور کشمکش و آسودگی میں سے حالی نے ثواب پانی اور آسودگی کو چنا اور زندگی سے ہار گئے۔ اور اسی لئے حالی کے یہاں وہ ہمہ گیریت اور آفاقیت مفقود ہے جو جدید دور کے اقبال جیسے شاعر کا حصہ ہے۔ اور وہ ستانہ روی بھی مفقود ہے جو شبلی کا حصہ ہے۔

اردو ادب میں
قدیم و جدید رجحانات کا سرسری جائزہ

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اردو ادب نے جھرجھری لے کر جب کلاسیکی روایات سے علیحدگی اختیار کی۔ تو نئے طرزِ فکر کی بنیادیں واضح ہوئیں۔ اور بے شمار ادبی تحریکیں نمودار ہوئیں۔ اور ان گنت رجحانات نے ادب میں اپنا اپنا مقام بنانا چاہا۔ ہر رجحان کی اپنی علیحدہ اہمیت ہے۔ اس سے اردو کو فائدہ ہی ہوا ہے۔ ترقی پذیر زندگی کے لئے ادبی و علمی مسائل کی آگاہی کے ساتھ ساتھ ۱۲۵ برس کے اس طویل عرصے پر محیط جو ۱۸۵۰ء سے ۱۹۷۵ء تک پھیلا ہوا ہے رجحانات سے واقفیت بھی بہت ضروری ہے

ہر تہذیب کی زندگی میں ایک ایسا مقام ضرور آتا ہے جب اس کے اندر کی تمام چیزیں ٹوٹنے پھوٹنے لگتی ہیں۔ تخلیق اور تخریب کی قوتیں ہر دور میں برسرِ پیکار رہتی ہی ہیں۔ ادبی شعور کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلاسیکی

رجحان کی گرفت نئے ادبی شعور پر کابوس کی طرح مسلط تھی۔ بے روح اصول پرستی اپنی منزلیں طے کر رہی تھی زندگی اور حسن چند گنے چنے اور محدود دائروں میں اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ عقلیت۔ ادب برائے ادب۔ کلاسیکت کی بنیادی کڑیاں تھیں۔ کلاسیکی رجحان کے طفیل کلاسیکی انسان۔ دنیا اردگرد کے ماحول زندگی اور اس کے متنوع امکانات سے بیگانہ تھا۔

یہ انسان حسن کو خانوں میں بانٹ کر مطمئن ہو گیا تھا۔ ادب ایک خاص طبقے کے لئے نغمۂ شادی یا نوحۂ غم کا سامان جوانی کے چونچلے تھے۔ یا محض چوما چاٹی تھی۔ روایت پرستی لکھے کی توسیع کا نام ادب تھا۔ اور ذرا آگے بڑھے تو تو روحانیت کا درس تھا۔ یا بے ثباتی دنیا کا بیان۔ جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھے جاتے تھے۔ انداز بیان ایسا تھا۔ جس پر یا تو محل والے خوش ہوتے تھے یا خانقاہ والے سر دھنتے تھے۔ عوامی زندگی سے کوئی سروکار نہ تھا زندگی کے حقائق سے متصادم ہونے کی روش کلاسیکی تحریک ہے۔ جہاں روایت کو فوقیت حاصل تھی۔ تجربے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

انیسویں صدی کے آخر میں غدر کے بعد ادبی بساط بھی الٹی جماعت کا مفہوم وسیع ہوا۔ سماج پر چھائے ہوئے قدامت پرستی کے رنگ کی سنڈیپرنگ شروع ہوئی۔ انفرادیت کے بجائے قومی نقطہ نظر کو اہمیت حاصل ہوئی فرسودہ

اصولوں اور فصاحت بلاغت پر روایتی انداز میں کسی حد تک مقصدیت غالب آئی۔ زندگی کے مسائل کو حل کرنے اور زندگی کی تلخیوں کو گوارا بنانے والی ایک ایسی تحریک نے جنم لیا جس میں قوم کے لئے درس تھا۔ سماج کو بدلنے کی آرزو کی غمازی تھی ایک ایسا آہنگ تھا جو روایتی ہونے کے باوجود کسی حد تک مختلف تھا

انگریزی سامراج نے مسلسل لوٹ کے لیے اپنی سلطنت کو مستحکم بنایا ہر وہ کوشش شعوری طور پر کی گئی جس سے مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی بیخ کنی ہو باشعور طبقہ اس تصادم میں نئی حیاتی اقدار کی روح پھونکنے میں مشغول ہوگیا۔ ایک طرف علمار کی تحریک چلی جو اس انگریزی نظام کی ہر چیز سے متنفر تھے۔ دوسری طرف کچھ لوگ روشن خیالی اور مشرق و مغرب کے ملاپ اور مغربی ادب کی اعلیٰ وارفع قدروں کی آمیزش سے اردو ادب میں نیا رجحان پیدا کرنے کی کوشش میں لگ گئے علیگڈھ تحریک۔ اور سرسید تحریک سے پہلے ادب میں ادیب اپنی حیثیت الگ بنانے کے حق میں تھا۔ سرسید تحریک نے ادب کی ہر صنف پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑی۔ اور بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہاں آرٹ کو آرٹ کی خاطر نہیں بلکہ اخلاق اور زندگی کو سنوارنے اور سدھارنے کی خاطر ادب کو حرکت۔ بلندی اور عظمت دینے کی غرض و غایت سے کام کیا گیا۔ یہ اصلاحی تحریک نئی تہذیب کی بڑھتی اور چڑھتی ہوئی روشنی سے کسب فیض کر کے ادب کے دائرے کو وسیع کرنے کے حق میں تھی۔ شخصی اور صنعتی کوچوں سے گزر کر نئے نظام کے دوش بدوش چلنے ہی میں مصلحت اور عافیت نظر آتی تھی۔

غدر ہوا طبائع مشتعل اور معیار سخت ہو گئے۔ وطن کے مسائل میں دلچسپی

لی جانے لگی۔ حب الوطنی اور آزادی کی تحریک نے جنم لیا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ غلامی انسان

کی تمام خوبیوں کو مٹا دیتی ہے اور غلاموں کے لئے زندگی کا وسیع اور تیز دھارا ایک تنگ اور گندہ نالہ بن جاتا ہے۔ اب ادب نے طرز کہن پر اڑے رہنے کے بجائے آئین نو کی طرف رخ کیا۔ اور اس رجحان نے روایت کے اندر رہ کر ادب میں کچھ نئے موضوعات کا اضافہ کیا۔

پہلی جنگ میں روس آمریت کے سرخ اندھیرے میں ڈوب گیا دوسری جنگ جمہوریت کو آمریت سے محفوظ رکھنے کے لئے لڑی گئی انسان ارد گرد کے ماحول سے کٹ گیا۔ اپنی ذات میں سمٹ جانے کے رجحان کو رومانوی تحریک کا نام دیا گیا۔ روایت پر تجربے نے غلبہ پایا۔ افراط و تفریط جذباتیت اور رومانوی تصور پرستی عام ہوئی۔ ادب میں جذبات کا ارتعاش خیال اور الفاظ کی تکرار بے جا تفصیل پسندی۔ تشبیہہ واستعارے کی آراستگی اور تصوراتی پیکروں کی چمکتی آب وتاب نے جگہ بنا لی۔ سطحی جذباتیت اضمحلال۔ افراط پرستی اور ماورائی دھند میں لپٹنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ عقل نے اس آتش زیر پار تربیت یافتہ آہنگ سے مربوط کرنے کی بات سوچی۔ عقل نے متحرک میزان کی تلاش کی اور جذبہ جنون اور روایت سے کچھ آگے بڑھا۔ نظریاتی مجبوریوں کے باعث ترقی پسند تحریک نئی فضا کو سمجھنے میں دشواری محسوس کر رہی تھی رومانویت کا زمانہ ختم ہوا اس نسل اور ان حالات نے دم توڑا جو مشرقی تمدن کو اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتے تھے۔ ترقی پسند تحریک رومانوی تحریک کی اس نسل کو

مشرقی پس منظر سے بہت دور لے گئی۔ ترقی پسند تحریک مغربیت اور اس کی ادبی اقدار کو جاگیردارانہ نظام اور ماحول میں منعم کرنے کی قایل تھی۔ اقتصادیات کا ڈھانچہ بدلا۔ بین الاقوامی حالات نے ہندوستان کو سیاسی۔ ذہنی اور تمدنی جھٹکے لگائے۔ اب ادب ایک نئے آہنگ سے متعارف ہوا۔ ایشیا میں نیا ضمیر جاگا۔ اور یہ نیا ضمیر ادب میں جذبات سے بہلنے والا نہ تھا۔ اسے تو نئے ادراک اور نئے شعور کی ضرورت تھی۔ تاثر پرستی کا دور آیا۔ انگریزی ادب کے سارے اصولوں کو اٹل سمجھا گیا۔ اور اسی کو معیار بنا کر ہر چیز کو پسند ناپسند کیا گیا۔ تغیر دشمن سماج نے جن حقیقتوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ نیا نظام ان پرانے اصولوں پر پوری طرح کار بند رہنے کو تیار نہ تھا۔ ادب میں پرانی ادبی اقدار سے بغاوت کا رجحان عام ہوا۔ تراجم ہوئے۔ نقالی ہوئی دوسرں کے ادبی سرمایہ کو اپنے یہاں سمونے کی منفی اور مثبت صورت اختیار کی گئی

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد بڑی انقلابی تبدیلیاں زندگی کے ہر شعبہ میں رونما ہوئیں ادب بھی ان سے متاثر ہوا۔ پورا نظام یکسر بدل گیا۔ زبردست سیاسی تحریکیں وجود میں آئیں۔ جس کو غدر کا نام دیا گیا وہ تو بیداری کی طرف ایک قدم تھا۔ ہندوستان چھوڑو تحریک کے وقت پورا ہندوستان یک زبان ہو کر انگریزوں کے خلاف ہو گیا۔ اہل وطن دفاعی جنگ میں معروف ہو گئے سارا ملک نعروں سے گونج اٹھا پلیٹ فارم سے انبوہ کو مخاطب کرنے کا رجحان عام ہوا۔ جوش ولولہ۔ خطابت کا انداز ادب میں بھی در آیا۔ ادبی دھارے کا یہ رخ سیاسی خلفشار سماجی ابال ذہنی انقلاب اور آزادی حاصل کرنیکی جدوجہد سے متعلق تھا

تقسیم ملک کے وقت پوری قوم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئی تھی۔ لیکن ملک کا بٹوارہ ہوتے ہی لوٹ کھسوٹ۔ انتشار بے ترتیبی اور موت کی ارزانی نے منافرت۔ تنگ نظری اور فرقہ وارت جیسے مہیب دیوزادوں کو لا کھڑا کیا۔ اب بہت سے سوالات ابھرے۔ ادب نے اپنے اردگرد کے ماحول سے سواد فراہم کیا۔ اور وہ انہیں باتوں کو عام کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔

اس کے بعد کی روشنی نے اس طلسمی فضا سے نکالا اور پھر اسکا ردعمل شروع ہوا۔ جو فسادات اور ان کے اثرات سے عام ہوگیا تھا۔

اردو ادب میں سیاسی۔ ملی اور قومی شاعری سے انحراف کے بعد علامت پسندی کا آغاز ہوا۔ اب حرکت عمل اور اجتماعی تحریکات کا دور دورہ ہوا روح کا کرب پیش کیا گیا۔ اس ادب سے بچا گیا۔ جو فراریت میں ہو کر تکرار اور تقلید پر تلا ہوا تھا۔ اب فرد اور اس کی ذات کو محور بنا کر ادب میں ذاتی تاثرات کو جگہ ملی۔ ذات کے انکشاف کے ساتھ خارج کی دنیا سے بھی تعلق رکھا گیا۔ جمود اور انحطاط سے نکل کر انتشار کا دور چلا۔ اب آدمی بے روح مشین کے پرزے سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ تھا۔ انسان کی ذاتی زندگی پر اداروں کی حکومت قائم تھی۔

جدید ادب نے انسان کے آزاد اور ذاتی وجود کو ہر طرح کی جبریت سے ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ آزاد کرایا اور ادب میں اسکو مستقل جگہ دلوانے کی کوشش کا آغاز ہوا فی الوقت جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ اپنے اندر واضح نقطہ نظر رکھتا ہے اور اس میں ماضی کی ان تمام تحریکوں کا

نچوڑ ہے جس سے ادب وقتاً فوقتاً متاثر ہوتا رہا ہے۔

ادب میں کوئی تحریک یا رجحان دس بارہ سال سے زیادہ نہیں چل پاتا۔ ادب کی تمام تحریکیں بالآخر روایت بن جاتی ہیں۔ جن کے خلاف انحراف اور جہاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ادب دراصل تشکیک اور پروٹسٹ کے بنیادی اجزا کا حامل ہے۔ اب ہم کلاسیکی تحریک۔ ترقی پسند تحریک۔ رومانوی تحریک سرسید تحریک اور جدیدیت سے آگے نکل آئے ہیں۔ ہر تجربہ تو کامیاب نہیں رہا لیکن ان تجربات نے ادبی کینوس کو وسعت بہت بخشی ہے آج کا ادب انسانی شعور کی عکاسی اچھے طور پر کر رہا ہے اور مکمل حقیقت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ کل دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

حسرت موہانی اور انکی غزل گوئی

۱۳ رمئی ۱۹۵۱ء کو ۷۵ سال کی عمر میں حسرت نے اس دنیا سے منھ موڑ لیا تھا۔ اور ان کو انوار باغ لکھنؤ میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ ان ۲۶ سالوں میں مولانا پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اس کے باوجود ابھی ان کی زندگی کے بہت سے مخفی گوشوں پر سے نقاب اٹھانا باقی ہے۔ حسرت کا جو سراپا نیاز فتحپوری نے کھینچا ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔

وہ پختہ طبیعت کے بڑے خوش مزاج انکسار پسند صلح کل اور سادہ وضع کے مرد انسان تھے۔ کورانہ تقشف سے عاری لیکن سماع کے شایق تھے شیروانی۔ ترکی ٹوپی شرعی پاجامہ ان کا مخصوص لباس تھا۔ لگاتے تھے سرمہ اور عینک۔ کھاتے تھے صرف پان۔ پینے کا قطعی شوق نہ تھا۔ تمباکو۔ شراب حقہ۔ اور سگریٹ جیسی چیزوں سے ہمیشہ اجتناب برتا۔ قد چھوٹا تھا رنگ صاف

تھا۔ آنکھیں بڑی تھیں۔ آواز باریک تھی چہرے پر چیچک نے نمایاں طور پر گل بوٹے کھلائے تھے۔ زندگی قلندرانہ تھی استغنا کی حد تک بہت ہی مختصر تمنائیں رکھتے تھے یعنی شعر و انسانیت کا دلکش امتزاج تھے۔

اپنے مذہبی عقیدے کے بارے میں خود حسرت کا یہ کہنا ہے "میں قدامت پرست سنی اور صوفی ہوں۔ تصوف کو مذہب کا جوہر سمجھتا ہوں اور تصوف ماحصل میرے نزدیک جذبہ عشق ہے۔"

حسرت کلیتاً غزل کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری تمام تر اسی دنیا کی عاشقانہ شاعری ہے جس کو گوشت و پوست سے علیحدہ کر کے دیکھنا ان کے ساتھ زیادتی کرنے کے مترادف ہے۔ عاشقانہ رنگ سخن میں وہ بلا شبہ قدر اول کے غزلگو شاعر ہیں۔ انسانی نفسیات پر ان کی گرفت کتنی زبردست ہے اس کے ثبوت میں سیکڑوں اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں ان کی کلیات میں ۷ ہزار سے اوپر اشعار ہیں۔ لیکن بہت ہی سختی سے انتخاب کرنے کے بعد بھی دس فی صد کا اوسط بآسانی نکل سکتا ہے۔ اور یہ دس فی صد اشعار شاعری میں ان کا لوہا منوانے کے لئے بہت کافی ہیں۔

حسرت جذباتی شاعر تو ضرور تھے۔ لیکن ان کی شاعرانہ عظمت کی دلیل یہ ہے کہ ان کی غزل شاعرانہ صداقت کے جوہر سے مالامال ہے ان کی غزل میں فکر و ضبط کی تلاش بے سود ہے ہاں ان کے غزلیہ اشعار سے ہم ان کے جذبات کے عروج و زوال کی تاریخ ترتیب دے سکتے ہیں۔ حسرت کی ناقابل معافی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک عشقیہ شاعری کی۔ اور

اس سے ان کی جیتی جاگتی شاعری کو اس حد تک نقصان پہنچا کہ شاعری میں انکے رتبہ کے بارے میں آج تک اختلاف ہے۔ لیکن حسرت کو محض اچھا شاعر کہہ کر خاموش ہو جانا بھی ان کے دون مرتبت ہے۔

کیا حسرت کی شاعری محض فراریت ہے؟ یعنی کیا انہوں نے اپنے ذوق جمال کو اپنے لئے پناہ گزینی کا حیلہ بنایا تھا؟ اور کیا حسرت دنیا کے فتنہ و آشوب سے بھاگ کر شاعری میں امن و سکون کے متلاشی تھے؟ کیا وہ محض ہیجانی شاعر تھے؟

نہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔ ان کی غزل کے مزاج کو سمجھنے اور انکی صحیح قدر کو پرکھنے کے لئے ان کے عہد کے تمام میلانات۔ رجحانات اور محرکات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ دراصل حسرت کی غزل کی جان زندگی کی وہ پرلطف اور بامزہ حقیقتیں ہیں جن کو پاسبان عقل سے جدا رکھنے کے بعد ہی سمجھا جا سکتا ہے حسرت اچھی طرح سمجھتے تھے کہ زندگی ہر وقت چہرے پر شکن ڈالے رہنے کا نام نہیں ہے۔ بڑے سے بڑے مفکر کو بھی اپنے دماغی سکون کی خاطر آسمان سے اتر کر زمین پر آنا ہی پڑتا ہے حسرت خوش قسمت تھے کہ انہیں موسم بہار کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے اور شباب کو شباب کی طرح گزارنے کے مواقع نصیب ہوئے اور زندگی کے ان ہی خوش کن لمحات نے ان کی غزل کو ایک نیا آہنگ بخشا۔

سب سے پہلے آئیے ذرا دیکھیں کہ حسرت سے پہلے اردو غزل کہاں آکر ٹھہر گئی تھی۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں عامیانہ رنگ کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا

تھا۔ مبتذل اور بازاری حرکات و سکنات کے اظہار نے اور مزے لے کر ان کے بیان نے اور ہوس کارانہ دل باختگیوں کے بے حجابی کے ساتھ بکھان نے فن کو مجروح کر کے رکھ دیا تھا۔ ادنیٰ درجے کی سفلی عیش کوشی اور لذت پرستی کی لے اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ غزل کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا تھا۔ غزل کی ترقی کی طرف کسی کا دھیان نہیں جا رہا تھا اس زمانے کے چند اشعار دیکھیے اور اس اختلاطی غزل سرائی اور شاعرانہ بنوٹ پر حکم لگائیے۔

گرے ہوتے الجھ کر آستاں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

آج کل میں داغ ہو گے کامیاب
کیوں مرے جاتے ہو دو دن کے لئے

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہے ایک کمسن کے لئے

یہ اٹھنا بیٹھنا محفل میں ان کا رنگ لائے گا
قیامت بن کے اٹھیں گے بھبھوکا بن کے بیٹھے ہیں

اسیر اتنا نہ چھیڑ اس کو سر شام
کہ شب بھر پیار کرنے کو پڑی ہے

صبح کو آئے ہو بھولے شام
جاؤ بھی اب تم رہے کس کام کے

ہاتھا پائی سے یہی مطلب بھی تھا
کوئی منہ چومے کلائی تھام کے

جو گونج اٹھی باسے کی جھنجلا کے بولے
لگے پیار کو آگ ابھی کان جاتا

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

چھیڑ دیتا تھا کہ پھر مار تھی دشنامول کی
ایک صیغہ تھا کہ فرفر اسے گردان گئے

خوش باشی۔ لذت پرستی۔ اور سستی جذباتیت پر مبنی ایسے اشعار سے دواوین کے دواوین پٹے پڑے ہیں اور یہ اشعار کسی دوسری یا تیسری صف کے شعراء کے نہیں ہیں بلکہ اردو شاعری کے مسلم الثبوت مشاہیر شعراء کے اشعار ہیں۔ اور جن کی سند کے بغیر اس زمانے کا کوئی شاعر شرف قبولیت حاصل نہ کر سکتا تھا۔ یعنی شاعری میں داغ۔ امیر اور جلیل وغیرہ کی حیثیت تاریخی ہے۔ زبان پر ان کے احسان عظیم سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ غزل میں رکاکت۔ ابتذال۔ پھکڑپن اور پست جذباتیت کی لے انہیں بزرگوں کے دم سے بڑھی۔ اس کا اچھا اور مثبت پہلو یہ ہے کہ ان کے دم قدم سے اردو زبان کی جمہوریت مستحکم ہو گئی اور منفی پہلو یہ ہے کہ غزل اپنی لطافت اور توانائی سے یکسر محروم ہو گئی اور اس پر طرہ سرسید تحریک جس نے غزل کو بیک قلم موقوف کر کے اس کو زندہ درگور کرنے کی شعوری کوشش کی اس کو گردن زدنی کیا اور اس کے گلے پر الٹی چھری پھیر کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی تدابیر اختیار کی گئیں

غزل کی طرف سے اجتناب اور بے التفاتی کو حسرت نے نہ صرف یہ کہ محسوس کیا بلکہ اردو غزل کی تہذیب وتحسین کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور آخر دم تک اس پر قائم ودایم رہے۔ حسرت سے اردو غزل کا نشاۃ الثانیہ شروع ہوا۔ اور انہیں کے دم سے اردو غزل کو اپنی کھوئی ہوئی آبرو واپس ملی۔ حسرت نے غزل کو نیا وقار بخشا جس کے لئے غزل ان کی ہمیشہ ممنون احسان رہے گی۔ اگر حسرت نے اس راز کو نہ پالیا ہوتا۔ تو امید نہ تھی کہ اردو غزل کبھی کوئی نئی کروٹ لے سکتی۔

حسرت کی غزل کی صحیح قدر وقیمت کو پرکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے دور کے تمام رجحانات۔ محرکات اور میلانات پر غایر نظر کی جائے ان کا مطالعہ کیا جائے۔ وہ چاہے۔ برہمو سماج تحریک ہو۔ سرسید تحریک ہو یا مسلم لیگ ہو۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جتنی بھی اجتماعی۔ معاشرتی۔ اصلاحی اور ادبی تحریکیں یا قوتیں بروئے کار آئیں۔ ان سب کے ساتھ قانونی یا غیر قانونی۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر حسرت کی شمولیت کے حوالہ جات مل جاتے ہیں اس کثرت میں وحدت کا عنصر حسرت کی غزل ہے جو سیاسی اور ہنگامی اتھل پتھل سے بے نیاز ہے حسرت ہمیشہ یہی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ غزل کو سیاست کی چھچھوری اور گندی غلاظتوں اور شعبدہ بازیوں سے پاک وصاف رکھا جائے۔ ان کے کام آیا ہے ان کا ریاضت نفس اور تربیت کردار اور اس کے لئے یقیناً برطانوی سامراج کے سفاکانہ مظالم کو داد دینا پڑے گی جن کی بدولت حسرت ایسے دھوئے گئے کہ بس

پاک ہو گئے۔ ان اذیتوں نے حسرت کا مزاج ایسا بنا دیا کہ انہیں نفس مطمئنہ میسر آگیا۔ اور ان کی غزل فراریت سے بڑی حد تک محفوظ ہو گئی۔ اور اسی وجہ سے حسرت کی غزل میں زندگی کے آلام و مصائب کی کسک کا احساس اور بیانیہ انداز لطیف رجائی اور پاکیزہ پیرایہ میں ملتا ہے۔ وہ غزل کے شاعر ہوتے ہوئے بھی قنوطیت سے قطعی دور ہیں

حسرت نے ۱۸۹۳ء سے ۱۹۵۰ء تک تقریباً سات ہزار اشعار کہے یعنی انہوں نے اپنی ۷۵ سالہ زندگی میں ۵۸ سال تک شاعری کی۔ اس حساب سے ان کی شباب کی شاعری کا دور ۲۵ سال ٹھہرتا ہے ۱۸۹۷ء سے ۱۹۲۳ء تک کی شاعری کے سخت انتخاب کے بعد جو اشعار اردو غزل کو ملے ہیں وہ بڑا قیمتی سرمایہ ہیں

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

بحیثیت مجموعی ان کی شاعری میں اس ضبط و ٹھہراؤ کی کمی ہے جو شاعر میں زندگی کا ادراک پیدا کرتا ہے۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ ان کی زندگی خانوں میں بٹی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔ علامہ نیاز فتحپوری کی ایک لائن ان کی شاعری پر اس تنقید سے بھاری ہے جو خلیل الرحمن اعظمی صاحب نے ان کی شاعری کے رتبے کے تعین کے سلسلے میں کی ہے یا دوسرے صاحب قلم حضرات نے ان کی شاعری پر کی ہے۔

ان کی شاعری شباب کی شاعری تھی جو شباب کے ساتھ رخصت

ہوگئی۔"

اس قسم کی تمام باتوں سے قطع نظر جو جیتا جاگتا انداز اور اسلوب حسرت نے غزل کو دیا۔ اس کی عظمت کا تعلق مطلق غزل سے ہے۔ غزل میں روایت پرستی اور قدیم سے لگاؤ خطرناک حد تک جڑیں پکڑ چکا تھا۔ اور منطقی حد سے گزر کر انحطاط کی حدوں میں داخل ہو چکا تھا یعنی غزل کے لئے ترقی اور توسیع کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ حسرت کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سیاست کے طفیل زندگی اور محبت کی تمام مشکلوں اور آزمائشوں پر غلبہ پایا اور پھر اس کو غزل میں برت کر ایک نئے آہنگ سے غزل کو روشناس کرایا۔

حسرت ایک خاص طرز کے غزل گو شاعر تھے۔ اور ان کے اس انفرادی رنگ کا موازنہ میر۔ غالب۔ مومن اقبال اور مصحفی کے رنگ سے کر کے ان کے حقیقی مرتبے کو ٹھیس تو پہنچائی جا سکتی ہے لیکن غزل پر ان کے عظیم احسان کو نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے انکار ہی کی گنجائش ہے۔ ان کے یہاں تو سب ہی کا رنگ ہے اس لئے کہ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور قدرت نے ان کو غیر معمولی ذہانت۔ حافظے اور سوجھ بوجھ سے بھی نوازا تھا۔ حسرت کی شاعری پر بیجا بی اور جذباتی شاعری کا ٹھپہ اس لئے لگایا گیا کہ وہ شباب کی لذتوں سے بھرپور طور پر لطف اندوز ہوئے لیکن یہاں یہ بھی خیال رکھنا پڑے گا کہ زندگی کی پر لطف اور بامزہ حقیقتوں میں اگر تفکر کو دخل ہو جائے تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جاتا ہے۔ شباب کی ان گوناگوں لذتوں سے حظ اٹھانے کے لئے پاسبان عقل کو تنہا چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔

ہیجانی شاعری سے ہٹ کر حسرت کی غزل میں شان ماضی کے ساتھ گراں مائگی مستقبل کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور ایک ایسا رجائی اور پرکیف لہجہ بھی جو اس سے پہلے کی غزل میں کمیاب تھا۔ حسرت اپنے ہم عصروں میں زیادہ مہذب شائستہ اور سنجیدہ تھے انکی معصومیت اور زندگی کے ساتھ ان کے بایاں خلوص نے ان کے انداز بیان کو دلکشی اور لب ولہجہ اور اسلوب کو سنجیدگی اور شائستگی عطا کی ہے جس کے ثبوت میں حسرت کے ہزارہا اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔ وہ حسن کا صحیح ذوق رکھتے تھے ان کے اندرون میں نفسیاتی گتھیاں بھی نہیں تھیں ان کے ظاہر و باطن میں بعد نہ تھا۔ وہ تمنا کی نظارہ بازی کو فطرت کا ایک معمولی تقاضا تصور کرتے تھے حسرت کی غزل کا ایک ایک شعر ایک ایک جذباتی ونفسیاتی تجربہ ہے وہ زندگی کو برتر از اندیشۂ سود و زیاں سمجھتے تھے اور حسن۔ خیر اور حقیقت کے بارے میں کائناتی بصیرت بھی رکھتے تھے۔ حسرت نے بڑی خوبی کے ساتھ قدیم کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اردو غزل کو نئی جان۔ وسعت اور جاندار توانائی بخشی ہے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

رو برو ان کے کچھ نہیں معلوم
کیا ہوا بے خودی میں کیا نہ ہوا

اثر حسن یار سے آخر
آگئی عشق میں بھی رعنائی

مرضی یار کے خلاف نہ ہو
لوگ مرے لئے دعا نہ کریں

بڑھ گئیں ہم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

نہ ملیں گے دل بیتاب کرے لاکھ اصرار
ہم بھی جا اب تجھے اور عہد شکن بھول گئے

ان اشعار میں اور ان جیسے سیکڑوں اشعار میں اردو شاعری کے اکابرین شعرا کے لطیف ترین عناصر اور کسب فیض کے ساتھ حسرت کی اپنی روح بھی جلوہ گری دکھاتی ہے۔ حسرت کی زبان دانی کا لوہا ماننا پڑے گا۔ حسرت زبان کے کرتب یا کرتوت نہیں دکھاتے بلکہ اسے بے تکلف استعمال کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ان کی غزل زبان، ذوق اور ظرف کے سارے تقاضے پورے کرتی ہے۔ حسرت کے یہاں بھی ہر حقیقی شاعر کی طرح جذبے کی اپنی زبان ہے۔ یوں تو حسرت کی عشقیہ غزل تمام تر مجاز پر مبنی ہے۔ لیکن خود حسرت کا اس مجازی عشق کے بارے میں یہ اعتراف ہے۔

مجازی عشق اک شے ہے لیکن
ہم اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی

اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ شاعری میں حسرت کا کوئی محور نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ حسرت کی شاعری اپنی تمام دلکشی۔ رجائیت اور دل گداختگی کے باوجود بڑی شاعری کی صف میں نہیں آتی لیکن یہاں ایک بات سمجھنے والی ہے۔ کہ بعض اوقات مزے کی بات کہنا بڑی بات کہنے سے زیادہ دشوار ہوتی ہے حسرت نے اپنے منفرد انداز کے ساتھ غزل کا اس وقت ساتھ دیا جب یہ بدنام تھی اور ملامت کے نرغے میں گھری ہوئی تھی۔ حسرت ہماری موجودہ غزل کا معیار ہیں۔ حسرت نے اپنی شائستگی اور شستگی کے ذریعے

جنسی جذبات کی بھی آخری حد مقرر کردی ہے بڑی بات یہ ہے کہ حسرت کو برتری کی خواہش کے اظہار و اعلان کا نہ تو ہوکا تھا۔ اور نہ شہدپن اور یہی چیز انہیں دوسروں سے منفرد اور ممتاز کرتی ہے۔

سرسید تحریک مقصدی تحریک تھی جس کا کلیتاً مقصد اردو ادب کو زندگی سے قریب لانا تھا اردو میں دراصل ترقی پسندی کا غالب رجحان اسی کا مرہون منت ہے۔ سرسید اور ان کے شموس ستہ کی کاوشوں سے ہمارے ادبی سرمایہ میں بہت اضافہ ہوا اس کو کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ اور اسی تحریک نے غزل کو جو پہلے ہی روبہ انحطاط تھی ایک ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچایا۔ پرانی وضع داریاں اور روایتی تصورات و اسالیب سے ہمارا روایتی لگاؤ ابھی باقی اس پر ایک کاری ضرب لگا کر صیقل کرنے کی ضرورت تھی اور یہ کارنامہ حسرت نے انجام دیا۔ یعنی ان کی چونکا دینے والی آواز سے تقویت لے کر ڈوبتی غزل نے سنبھالا لیا حسرت کے اس لہجے کی بازگشت کو سمجھنے کے لئے ایک ذرا نازک صلاحیت درکار ہے۔ ردیفوں کی خانہ پری یا مجبوری قافیہ پیمائی یا عشق مذہبی عقیدے اور قدما کی تقلید میں کہے گئے اشعار حسرت کے یہاں ہیں تو ضرور لیکن یہ ان کو صحیح نمائندگی دلانے سے قاصر ہیں ان سے ہٹ کر عاشقانہ تیور سے کہے گئے خالص تغزل کے ان اشعار کی بھی کمی نہیں ہے جن میں مختلف رنگوں اور اسلوبوں کا امتزاج ہوتے ہوئے بھی ایک منفرد اور سحر کن آہنگ ہے جس کا جواب غزل کی پوری تاریخ کے پاس نہیں ہے۔

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی — مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری
گر یہی ہے ستم یار تو ہم نے حسرت — نہ کیا کچھ بھی جو دنیا سے کنارہ کیا
کون لاتا ترے عتاب کی تاب — خیر گزری کہ سامنا نہ ہوا

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

یہ آواز اس آواز سے بالکل مختلف ہے۔ جو اس وقت رائج تھی اس کے علاوہ حسرت نے سب سے پہلے غزل کو سیاسی رنگ سے روشناس کرایا۔ اس میں ان کے ماحول کا اثر نمایاں ہے لیکن ان کے ایسے تمام اشعار میں سیاسی شعور کا فقدان ہے۔ حسرت غزل کے شاعر ہیں اور اسی کی آبرو بچا کر اور اسی کو پروان چڑھا کر انہوں نے غزلیہ شاعری کا حق ادا کر دیا ہے۔ جس میں شدت احساس کے ساتھ ساتھ خلوص و صداقت کی وہ دھیمی آنچ ہے۔ جس کا تعلق خوبی و لطافت سے ہے غزل سے اس وابستگی کا اعتراف خود حسرت نے ان الفاظ میں کیا ہے "طبیعت نے اپنے لئے اصناف سخن میں غزل کو اپنے حسب حال پا کر منتخب کر لیا ہے۔" اچھی اور بڑی بات یہ ہے کہ حسرت نے خود کو پا لیا تھا۔

حسرت کا عشق متوسط طبقے کا انسانی اور مجازی عشق ہے انہیں بازار اور خانقاہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اور اپنے اس گوشت پوست کے زندہ اور شوخ محبوب کی نفسیات کے بارے میں جو جو نکتے انہیں معلوم ہیں وہ اس راہ کے امیدوار کے لئے کتنے ضروری ہیں اس کا احساس ان کی غزل کے دوسرے

شعراء کی غزلوں کے تقابلی مطالعے کے بعد ہی ہوتا ہے مبالغہ نگاری سے قطع نظر شائستگی کے ساتھ مجازی پیرایہ میں غزلگوئی کرنے میں حسرت اپنا ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ حسرت کے تزکیہ نفس کی بدولت غزل باعث ننگ نہیں بن پائی۔ ان کے سلیقے اور ذوق کے طفیل غزل کے وقار میں اضافہ ہوا۔ ورنہ جرات کی طرح مبتذل جذبات کی نفخ ان کو کہیں کا نہ رکھتی۔ غزل کے تقاضوں پر حسرت نے ہمیشہ نظر رکھی ہے۔ اگر ان کے مزاج کی انتہاپسندی غزل میں بھی آجاتی تو ہماری غزل لطف تازگی اور ترنم سے محروم ہوگئی ہوتی اور حسرت کا نام صرف صحافی کی حیثیت سے زندہ رہتا۔ یعنی وہی پیش پاافتادہ رجحان جو غزل میں چلا آرہا تھا غزل اور حسرت دونوں کے لئے فال بد ثابت ہوتا۔ پر اس لئے نہیں ہو پایا۔ کہ ایک تو غزل حسرت کے سیمابی اور انتہاپسند مزاج سے مطابقت رکھتی تھی دوسرے حسرت کو خود جذبات تخیل اور زبان پر بڑا ملکہ تھا۔ اور تیسرے اس میں ان کے خلاقانہ ذہن اور وسیع مطالعے کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

حسرت کو غزل کا امام کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہئے ان کی غزل بڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ ہم بھی اس دیار سے گزرے ہیں جہاں حسرت کھڑے ہیں۔ ان کی غزل مصنوعی غمازے جھوٹے ملمع۔ نفسیاتی الجھنوں۔ پرتوں۔ پہتوں سے بری اور پاک ہے ان کی غزل کے اشعار مزاج اور وجدان پر چاہے وہ تاثر نہ چھوڑتے ہوں۔ جو صف اول کی شاعری کے لئے مخصوص ہے۔ تاہم وہ اپنی حیثیت کا لوہا منوا لیتے ہیں۔ حسرت نے شاید قدر اول کے شاعر اس لئے

اس لئے نہیں بن پائے کہ انہوں نے اپنی غزل گوئی کے لئے سارا مواد۔ زور۔ قوت اور توانائی دوسرے درجے کے شاعروں سے لیا ہے۔ انہوں نے صف اول کے شاعروں کا تتبع کرنے سے گریز کیا ہے۔ یعنی دویم صف کے متقدمین اور متاخرین شعراء کے یہاں جو باتیں مبہم اور اشاروں میں ہیں ان کو ترقی دے کر انہوں نے اس منزل پر پہنچایا جہاں وہ قدر اول کی چیز معلوم ہوتے ہیں بقول فراق گورکھپوری۔

"بحیثیت مجموعی یا نفس شاعری کے لحاظ سے اگر وہ کسی سے کم ہیں تو میر۔ آتش اور غالب ہی سے کم ہیں اور کسی سے نہیں۔"

حسرت نے شاعری سے غم غلط کرنے صبر و شکر کی عادت ڈالنے اور اخلاق سنوارنے کا کام لیا ہے۔ ان کا مجازی عشق بھی عام روایتی عشق سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے یہاں عشق کا ایسا تصور ہے جس میں مقامی کیفیت کے ساتھ بنیادی ایمائی جذبات و نفسیات کی کارفرمائی ہے۔ اور جو فکر سے بڑی حد تک ماورا ہے۔ جہاں پاکیزہ لذتیت کا معتدل اور دھیما دھیما پن ہے۔ اسی سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے کہ حسرت نے سماجی حالات سے کسی حد تک مطابقت پیدا کر لی تھی۔ ان کے یہاں متوسط طبقے کی ترجمانی میں مانوس۔ مقامی اور واقعیت کا رنگ ہے۔ فضا روایتی سہی لیکن اس فضا میں نہ نامانوسیت و اجنبیت ہے۔ اور نہ ہم یہاں یک رنگی۔ یکسانیت اور محض ہوسناکی سے بور ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے عشقیہ کیفیات کا واضح

اور دو ٹوک بیان حسرت کی فطرت انسانی سے آگاہی۔ جنسیت کے بارے میں ان کی وافر معلومات۔ مادیت اور عشق سے متعلق اسرار و رموز کی آگہی پر دلالت کرتا ہے۔ ان کا عمومی اور واضح تصور عشق افلاطونی عشق سے قطعی مختلف ہے۔ نفسیاتی مزاحم سے عاری اسی نفسیاتی زاویہ نظر اور اچھے معیار کی وجہ سے حسرت کے یہاں جو جدت اور اپج پیدا ہو گئی ہے وہ اردو شاعری میں نہیں کے برابر ہے۔

حسرت نے اپنے تغزل کی بنیاد سماجی پس منظر پر رکھ کر پاکیزہ انداز میں اس کی ترجمانی کی ہے اور کمال یہ ہے کہ فن کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ مزاج کا جمالیاتی پہلو جو غزل کی جان ہے ہر جگہ جاری و ساری رہتا ہے۔ جس نے نغمگی اور ترنم کے ساتھ نئے آہنگ سے اردو شاعری کو واقف کرایا اور اس کے خزانے کو مالا مال کر دیا۔ آج کی غزل شگفتگی۔ رعنائی فسوں کاری اور جادو اثری کے لئے حسرت کی ہمیشہ ممنون احسان رہے گی۔ جنہوں نے غیر صحت مند ماحول میں صحت مند اور توانا شعری عناصر شامل کر کے غزل کی آبرو بچالی۔

بقول معارف

"آخری دور کے بگڑے ہوئے مدرسہ شاعری کی اصلاح انہوں نے ہی کی ہے اور بے لطف۔ رسمی تفریح کو صحیح معنوں میں دل کی واردات بنا دیا جس میں حقیقی تغزل کی ساری لطافتیں اور رعنائیاں موجود ہیں۔"

ن م۔ راشد آزاد نظم کے خالق

ہم جب ن۔ م۔ راشد کی دستار اتار کر دیکھتے ہیں تو اس کے نیچے بڑا سر نظر آتا ہے۔ جو درمیان میں بالوں سے بے نیاز ہے اسے گنج سے نہیں گنج گراں مایہ سے تعبیر کیجیے۔ ان کا لباس۔ وضع قطع اور گفتگو کا لہجہ عام لوگوں سے مختلف تھا۔ جس میں مشرقیت کم اور مغربیت زیادہ تھی۔ یہ سانولا سلونا شخص عالم فاضل تھا۔ اردو۔ فارسی۔ انگریزی پر انھیں پوری طرح عبور تھا۔ ان کے علاوہ انھوں نے دوسری کئی اور زبانوں کے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہ برٹش سول سروس کے ایک بڑے اور ذمہ دار آفیسر تھے۔ ۷۶ء میں یو این کے دفتر اطلاعات کے ڈائرکٹر رہے اور طہران میں مقیم تھے۔ انگریزوں جیسا ہی سلجھا ہوا بانکپن اور رکھ رکھاؤ بھی رکھتے تھے۔ انھیں اپنی صحت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ تندرستی اچھی تھی اور جسم میں توانائی رکھتے تھے۔ اس

کار از بھی شاید انگریزوں جیسی غذا کھانے ہی میں مضمر تھا۔

لیکن اس سب کے باوجود ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو لندن کے ایک اسپتال میں ان کی روح قفس عنصری سے کوچ کر گئی۔ اردو کے اس بڑے اور اہم شاعر کا دل جس کا پوسٹ مارٹم انگلستان کے ایک سرد مردہ خانے میں کیا گیا۔ ایک عرصے تک دھڑکتے دھڑکتے ساکت و جامد ہو گیا۔ وہ مرنے کو بہت سہل کام سمجھتے تھے "مجھے موت آئے گی مر جاؤں گا میں" اور اسی آسانی کے ساتھ وہ مر بھی گئے۔ جو سفر انھوں نے گجرانوالہ سے ۹ نومبر ۱۹۱۰ء کو شروع کیا تھا۔ وہ ۶۵ برس کے بعد لندن کے مضافات میں ختم ہو گیا۔ جہاں وہ چیپل ہام میں اپنی اینگلو اطالوی بیوی شیلا کے ساتھ ایک عمر تک قیام پذیر رہے۔ مذہب میں چونکہ وہ لاادریت کے قایل تھے اس لیے مرنے کے بعد ان کی لاش بجائے دفنانے کے نذر آتش کی گئی۔ راشد صاحب کی موت سے اردو کی آزاد نظم کو بڑا دھچکا پہنچا۔

ماورا۔ ایران میں اجنبی اور لامادی انسان ان کے شعری سفر کی تین منزلیں ہیں۔ ن۔ م۔ راشد کی شاعری میں وہ مقناطیسی کشش ہے کہ اسے کبھی کبھی پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اچھی شاعری کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اسے کبھی کبھی پڑھنے کو جی چاہے۔ ان کے کلام میں گہرائی اور گیرائی ہے استعاروں اور کنایوں میں پہنائی اور رسائی ہے۔ ان کے تخیل کا افق وسیع و عریض ہے جس میں تفکر کا عنصر غالب ہے۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود راشد صاحب کا شمار اس

عہد کے بزرگ اور اہم شعرا میں زیادہ پیچھے نہیں ہے۔ وہ باغی شاعر تھے۔ لفظ و معنی کے اعتبار سے یہ جدید شاعری کے بانی ہیں۔ آزاد نظم کے خالق کی حیثیت سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کی بڑی خصوصیات میں سے حسن مزاح اور مشرقی وضع داری کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ رہن سہن کا ڈھنگ انگریزی، دماغ، مشرقی۔ قلب مومن اور توازن مغربی رکھتے تھے۔ یہ مشاعروں کی ہلڑ بازی سے بہت گھبراتے تھے۔ اس کے برخلاف مخصوص نشستوں میں بڑے چاؤ سے شرکت کرتے تھے۔

نذر محمد راشد صاحب نے شعوری طور پر ایک نیا اور جدید راستہ اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ اور مسلسل ۳۰ برس تک تنقید نگاروں اور رواج پرستی کے متوالوں کے طعنے و تشنے سہے تھے۔ یہ روایت ساز شاعر ہیں جنھوں نے اپنے تخلیقی تخیل کی بدولت اردو کی شعری روایات کو دلآویز اور ذرا غیر ملکی رمز بخشی۔ اور جدید ایرانی شاعری کی واقفیت نے سونے پر سہاگے جیسا کام کیا۔ یہ شرق اوسط کی اساطیری اور عمرانی تلمیحات بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے پڑھنے کا لہجہ ایرانی تھا ۔

سلیماں سر بہ زانو اور سبا ویراں

جن دنوں ان کا پہلا شعری مجموعہ ماورا چھپا۔ اس زمانے میں آزاد نظم اپنے لیے مقام بنا رہی تھی۔ نئے تجربے کرنا عیب کی بات نہیں ہے۔ لیکن جب تجربہ بے ہودگی کی علامت بن جائے تو تجربہ کرنے والے کی دماغی صحت یا ذہنی توانائی پر شک ضرور ہوتا ہے۔ ن۔م راشد کے اس تجربے پر

یہ بات صادق اس لیے نہیں آتی کہ انھیں نے یاوہ گوئی اور بے ہودگی سے ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھا۔ انھوں نے تجربوں کے جوش میں ادب کی توانا قدروں کی پائمالی نہیں کی ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نئی زبان اور ایک نیا اور اچھوتا پیراہن دلانے کے لیے ۴۰ سال تک جد و جہد کی۔ یہ شاعری کو زندگی کے حقائق سے قریب لائے ہیں انھوں نے روایاتی شاعرانہ اسلوب اور ہیت میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ پرانی شاعری سے خود بغاوت کی اور نوجوان شعرا کو اکسا کر اچھے اچھے دماغوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ شاعری کا دائرہ محدود ہے اس میں نثر کے مقابلے میں امکانات کم ہیں تاہم راشد زندگی اور ذات کے سربستہ راز زیادہ اعتماد کے ساتھ نظم کے پیرایہ میں بیان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں ان کے تینوں دیوان اپنے اندر بڑی توانائی رکھتے ہیں۔

یہ فیض کے ہم عصر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کا آہنگ فیض سے بالکل مختلف ہے۔ ابتدا میں ان میں فیض کے اثر کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ فیض کے اثر سے نکل آئے ہیں۔ ابتدائی شاعری میں اور ماورا کی کچھ غزلوں اور نظموں میں فیض کی شاعرانہ شخصیت اور ان کے خیالات کے کچھ خدوخال بھی مل جاتے ہیں۔ ماورا کی نظموں نے ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت ایک پورا طبقہ ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا تھا۔ ان کی اہمیت کو کم کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ عنفوان شباب میں ان کی نظمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اس کو آپ چاہے جوانی کا ہیجانی ابال کہیں یا شباب کا تقاضائے فطری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی ان مصرعوں سے شروع ہونے والی نظمیں

اپنے اندر بھرپور تاثر رکھتی ہیں۔

آمری جاں مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوار سحر چومتے ہیں
مسجد شہر کے میناروں کو (۱)
اے حسین واجنبی عورت اس لیے اب تھام لے
اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر لیکن جھپٹ سکتا نہیں (۱)

ترے بستر پہ مری جان کبھی   آرزوئیں تیرے سینے کے کہستانوں میں ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رو تی ہیں۔ اس وقت ان اشعار کی کچھ تلمیحات مبہم اور عجیب معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن اب یہ اچھی طرح سمجھ میں آگیا ہے کہ مسجد کے مینار شاعر کی تشنہ آرزوئیں ہیں اور افریقی حبشی کا رینگتا ہوا جسم سیاسی استعارہ ہے۔ یعنی ماورا کا انسان شکست خوردہ ہے۔ اس میں اضطراب پوشیدہ ہے اور وہ رومانیت زدہ ہے۔ اس میں فراری کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ سیاسی غلامی کے لیے عورت کے جسم سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ وہ خودکشی کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس مجموعے میں لفظ و استعارے کی تازگی ہے۔ یہاں شعری آہنگ میں نشاطیہ کیفیت ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو ان کے دل میں بیٹھا ہے اور بغاوت پر آمادہ ہے۔ زندگی اور اس کی قدروں کو جوں کا توں قبول کرنے میں ہچکچاتا ہے۔

یہ کمیونزم کے مخالف تھے۔ ایران میں اجنبی میں چند نظمیں کمیونزم کی مخالفت

میں لکھی گئی ہیں جن پر رجعت پسندی کا ٹھپہ لگانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء میں کمیونسٹ ہونا چاہتے تھے۔ جس کی ممبری کے لیے انھوں نے درخواست بھی گزاری تھی۔ لیکن زیادہ واضح حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر کوئی بھی لیبل لگوانے سے ڈرتے تھے وہ اظہار ذات اور تحسین ذات کو پورے بنی نوع انسان کا مسئلہ اور مشترکہ حق سمجھتے تھے۔ گروہ بندی سے انھیں للہی بیر تھا۔ وہ تو اپنے عہد کا اظہار دردِ دل سے مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ چاہے اس میں فنی پیرایہ یا حسی تجربات کی روح آئے یا نہ آئے۔ ہاں ذہن میں سوالات ابھرتے ہیں۔

۱۔ کیا ان کی شاعری روح سے خالی ہے۔

۲۔ کیا یہ شخص محض ٹیکنیکل شاعری کرتا تھا۔

تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ ان کی شاعری نہ بے روح ہے اور نہ ٹیکنیکل۔ راشد کے نزدیک وہ فطرت انسانی جو شعروادب کی تخلیق کرتی ہے غیر منقسم اور یکساں ہے۔ جغرافیائی فاصلے اس پر کم ہی اثر انداز ہوتے ہیں۔

ترقی پسندی کے بارے میں راشد نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔

۱۔ کمیونزم اور ترقی پسندی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

۲۔ ترقی پسند مخلص نہیں ہیں انھوں نے ترقی پسند نقطہ نظر کو اصول یا مسلک کے طور پر استعمال نہیں کیا ہے۔

۳۔ سیاسی اقتدار بزورِ قائم ہونے سے انسان کے ان اختیارات کی نفی ہوتی ہے جو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت کیے گئے ہیں۔

۴۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ادیب سے کسی خاص قسم کا ادب تخلیق کرنے کا حکم یا ہدایت دے۔

کمیونزم۔ ترقی پسندوں کی اصول پرستی۔ سیاسی اقتدار کو قوت کے بل پر حاصل کرنے والی بات اور ادیب کی شخصی آزادی سے متعلق جن خیالات کا اظہار راشد صاحب نے کیا ہے۔ ان سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔ تاریخی اعتبار سے ان سب میں کلیتاً درستی کا پہلو نہیں نکلتا۔

لا = انسان کی نظموں میں ایک فلسفیانہ رنگ اور گمبھیر رچاؤ ملتا ہے۔ اور ایک مخصوص ڈکشن ہمارے ذہن کی بہت سی پرتوں کو کھول دیتا ہے۔ وہ انسان جو ماورا میں رومانیت پسند ہے اور جو ایران میں اجنبی میں انگڑائی لیتا ہے۔ لا = انسان میں یہ انسان حسن کے بعض گوشوں سے نقاب اٹھاتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ماورا والے انسان کی نفی بھی کرتا ہے۔ یہ ایک پر کیف شخصیت ہے جو زندگی کے رنگ و نور میں نہا رہی ہے۔ اور مستقبل کے بہتر انسانوں کے خواب میں کھوئی ہوئی ہے۔ لا = انسان ص ۱۰۲

وہ خواب ہیں آزادیٔ کامل کے نئے خواب
ہر سعیٔ جگر دوز کے حاصل کے نئے خواب
آدم کی ولادت کے نئے جشن پہ لہراتے جلاجل کے نئے خواب
اس خاک کی سطوت کے منازل کے نئے خواب
یا سینۂ گیتی میں نئے دل کے نئے خواب

راشد کے اس انسان کا یہ تصور بے یقین لوگوں کے لیے موت کا پیام ہے۔

ان کی شاعری زیادہ تر فارسی آمیز ہے۔ انھوں نے لفظوں کو ایک نیا احساس اور آہنگ کا ایک جدید۔ بلند اور پر وقار شعور دیا ہے۔ یہ مغربی فنکار کے بنیادی وژن اور اس کی فکری توسیع کو بہت اہمیت دیتے ہیں ان کی شاعری میں ذہنی موسیقی کے پس منظر کے ساتھ رومینٹک امیجری اور فکری پہلو نمایاں ہے۔

جہاں زاد نیچے گلی میں ترے در کے آگے

یہ میں سوختہ سر + حسن کوزہ گر ہوں۔ تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطّار یوسف کی دکان پر میں نے دیکھا + تو تری نگاہوں میں وہ تابناکی نہ تھی + جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں + جہاں زاد۔ نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں۔ اس میں ایک ڈرامائی تسلسل اور جادوئی تکرار ہے اور الفاظ کا پھیلاؤ ہے۔

اے عشق ازل گیر و ابد تاب مرے بھی ہیں کچھ خواب

میرے بھی ہیں کچھ خواب

جہاں کہیں تاریکی اور سیاہ اندھیرا ہے وہاں آرزو کی راہبہ شمع لے کر آجاتی ہے۔ تصور انسان کی اس بالیدگی نے راشد کے شعری آہنگ کو توانائی بخشی ہے۔

اپنے شعری نظریہ کے بارے میں خود راشد نے لا = مساوی انسان کے دیباچہ میں روشنی ڈالی ہے، مشہور رقمطراز ہیں ؎

"میں نے اپنی نظموں میں مارکس کی تعلیم پر نہیں بلکہ صرف اسٹالن کے عہد کی ہمہ ادستی اور سیاسی چیرہ دستی پر حرف زنی کی تھی میرے لیے یہ تسلیم کرنا ہمیشہ مشکل رہا ہے کہ ترقی پسندوں کو میری نظموں میں اجنبی حکومت یا استعمار کے خلاف آواز کیوں نہیں سنائی دیتی۔ یا مذہبی ریاکاری۔ آمریت اور معاشرتی اور جذباتی

پابندیوں کے خلاف میرے شدید ردعمل کو انھوں نے کیوں نہیں محسوس کیا جبکہ اس قسم کے افکار انھیں ہمیشہ عزیز رہے ہیں اور بعض مسائل پر میرا نقطۂ نظر ان کے اپنے اندیشوں اور ارمانوں سے بہت دور بھی نہیں "

ترقی پسندوں کے بارے میں ہی آگے چل کر لکھتے ہیں۔

" میں ترقی پسندوں کی رسمی برادری سے ہمیشہ باہر رہا ہوں کیونکہ مجھے سیاسی یا نیم ادبی لیبل لگا کر سربازار نکلنا اس وقت گوارا نہ تھا اور نہ اب گوارا ہے لیکن میری خوش قسمتی ہے کہ آج بھی اکثر ترقی پسندوں کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات خوشگوار ہیں اور میں فرداً فرداً ان میں سے اکثر کے کمالات کا معترف ہوں "

لا = انسان ص۲۹ ۔

" اگر ہم لفظ کی اس قوت سے منکر ہو جائیں تو گویا توراۃ اور انجیل سے لیکر مارکس اور اقبال تک کسی کی ضرورت باقی نہ رہے "

م راشد صاحب کارل مارکس کے احترام کا جذبہ رکھتے تھے۔ کچھ آگے بڑھ کر اپنے ہمعصر شاعروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

" میں نے ایک آدھ مضمون میں بعض نئے شاعروں پر بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن میری تنقید ان میں سے بعض کو ضرورت سے زیادہ ناگوار گزری ہے میں ان میں سے اکثر کی اس جرأت کا دل سے قایل ہوں کہ جو وہ الفاظ کے انتخاب اور ساخت پرداخت میں برتتے ہیں لیکن ان میں سے بعض نے اشیا اور مفہوم کے ساتھ اپنا ربط قائم کرنے سے انکار کر رکھا ہے۔ بحیثیت ایک مکتب شعر کے جدید شاعری کا یہ گروہ کسی اجتماعی ذمہ داری کا قایل بھی نظر نہیں آتا انھیں اس

دانش کے اظہار سے بھی غرض کم ہے ۔ جن کا حاصل شعر رہا ہے ۔ یہ شعر کو بشیتر ذاتی خوشنودی کا ذریعہ مانتے ہیں ان میں سے بعض کے بیان میں زندگی کے اظہار کے لیے گہری اور جوشیلی محبت ضرور پائی جاتی ہے اور انسانی تہذیب کے بعض صحت مند عناصر کا ذکر بھی ان کے کلام میں ملتا ہے لیکن یہ کسی قسم کی مسئولیت (؟) قبول نہیں کرنا چاہتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض اس بے نظمی کے شاعر رہ گئے ہیں جو تہذیبوں کے زوال کا باعث ہوتی ہے ۔ اجتماعی تحت شعور کی عکاسی کرنا برحق لیکن اگر یہ عکاسی معاشرے کی نارسائیوں کو دور نہ کرسکے تو کم از کم ان بے اطمینانیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہیئے جن سے آج کی دنیا اٹی پڑی ہے ۔ زندگی کھیل تماشے سے کہیں زیادہ ہے اور صرف طفلانہ ذہن اسے کھیل تماشا سمجھ کر خوش ہو سکتے ہیں ؎

اس سے یہ ظاہر ہے کہ راشد صاحب جدیدیت کے نام نہاد گھن گرج اور بے راہ روی سے قطعی خوش نہ تھے ۔ ان کے یہاں جابجا ان کے کلام سے ظاہر ہے ۔ شاعری ایک سماجی ذمہ داری کا عمل ہے ۔ شعر کھیل تماشا نہیں ہے ۔ بلکہ اس میں دانش کا اظہار ہونا چاہیے ۔ اور شعر کو تہذیب کے زوال کا باعث نہیں بننا چاہیے شعر تہذیب کی سربلندی اور وقار ہے اور انھوں نے اپنی شاعری میں اسی سربلندی اور وقار کو قائم رکھا ہے ۔ ان کے تینوں شعری مجموعوں میں ان تصورات کے ارتقا کا مسلسل سفر ہے اور فکر جذبے پر حاوی ہے اس کی محکوم نہیں ہے ؎

لب اگر نہیں ہلتے ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں

ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں راہ کا نشاں بن کر

نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں صبح کی اذاں بن کر

ان کی ایک نظم تعارف ہے جو لا = مساوی انسان میں ص ۷۶ پر مرقوم ہے۔ اس سے ان کے ذہن کی بہت سی جہتوں کا پتہ چلتا ہے۔

اجل ان سے مل + کہ یہ سادہ دل + نہ اہل صلوٰۃ اور نہ اہل شراب + نہ اہل ادب اور نہ اہل حساب + نہ اہل کتاب۔ نہ اہل کتاب اور نہ اہل مشین + نہ اہل خلا اور نہ اہل زمیں + فقط بے یقین۔ اجل ان سے مت کر حجاب۔

اور یہ ہے سالگرہ کی رات جس میں — یاد کی روشن آگ دہک اٹھی ہے
ابھی سرحد سے لوٹا ہوں ابھی — میں ابھی ہانپ رہا ہوں مجھے دم لینے دو
راز وہ ان کی نگاہوں میں نظر آیا ہے — جو ہمہ گیر تھا۔ نادیدہ زبانوں کی طرح
یاد کی آگ دہک اٹھی ہے — سب تمناؤں کے شہر دل میں دہک اٹھی ہے
آج دروازے کھلے رہنے دو — شاید اس رات ہمارے شہدا آجائیں
شاید اس شام ہی — دروازوں پر دستک دینگے اس دور سے
اس دور کے سوکھے ہوئے دریاؤں سے — پھیلے ہوئے صحراؤں سے اور شہر کے
ویرانوں سے + ویرانہ گروں سے میں حزیں اور اداس۔

اور اب ان کی دو منتخب نظموں کو پیش کیا جا رہا ہے جن سے ان کے کلام کی معنویت کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ پہلی نظم ہے گداگر اور دوسری نظم ہے ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے۔

(گداگر) جن گزرگاہوں پہ دیکھا ہے نگاہوں نے لہو + یا یہ عورت کی آنکھوں

ہیں یہ سہم + کیا یہ اونچے شہر رہ جائیں گے بس + شہروں کا وہم + ہیں گداگر اور مرا دریوزہ فہم راہ پیمائی عصا - اور عافیت کوشی گدا کا لنگ پا + آرہی ہے ساحروں کی شعبدہ سازوں کی صبح + تیز پا گرداب آسا + ناچتی بڑھتی ہوئی + ایک نئے سدرہ کے نیچے ایک نئے انسان کی ہو + تا بہ کے روکیں گے ہم کو چار سو - کیا کہیں گے اس نئے انسان سے ہم - ہم تھے کچھ انساں سے ہم - رنگ بہ رنگ کرتے تھے ہم باران سنگ + تھی ہماری ساز و گل سے نغمہ و نکہت سے جنگ + آدمی زادے کے سایہ سے بھی تنگ

"ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے"

صبح کے سینے میں نیزے ٹوٹے + اور ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے - جسم کے ساحل آشفتہ ہر اک عشق کا مارا ہوا + انسان ہے آسودہ مرے دل میں سر ریگ تپاں + میں فقط اس کا قصیدہ خواں ہوں - ریت پر لیٹے ہوئے شخص کا آوازہ بلند + دور کی گندم وہ لے

تاک کی شاخ پر اک قافلہ زنبوروں

صندل و جسم لایا ہے - کیسے زنبور ہمیشہ سے تمنا کے خداؤں کے حضور - سربسجدہ ہیں مگر مشعل جاں کے ہر اک سمت رواں + خون ہی دن نکلے گا اور شہر + جوان میوہ فروشوں کی پکاروں سے چھلک اٹھے گا + میں بھی ہر سو ترے مژگاں کے سفیروں کی طرح دوڑوں گا - دن نکل آیا تو شبنم کی رسالت کی صفیں تہہ ہوں گی + راستے دن کے سبہ جھوٹ سے لد جائیں گے + بھونکنا چھوڑ کے پھر کاٹنے لگ جائیں گے - غم کے کتے اور اس شہر کے دلشاد مسافر جن پر ان کے سایہ سے

بھی لرزہ طاری + بنکر خواب کے مانند سرِ راہ پلٹ جائیں گے۔ رات یوں چاہا
تجھے میں نے کہ تو فرد نہیں + بلکہ آئندہ ستاروں کا ہجوم + صبح کے سینے سے
نیزے ٹوٹے ۔ اور ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے ۔

اب بھی اک جسم مرے جسم سے پیوستہ ہے + جیسے اس ریت پہ لیٹے
ہوئے انساں کا قالب ہو یہی + جسم جس کا میں قصیدہ خواں ہوں ۔ دن نکل
آئے گا ۔ زنبوروں کی سوغات گل و تاک پہ کچھ بار نہیں + اپنی زنبوروں کی
محنت کے پسینے سے درختوں کو ملی + تاب کہ رویا دیکھیں ۔ کسی دوشیزہ کا رویا
جیسے شیرینی لب بار ہو ۔ زیبائی جہاں بھی ہو سلام + تیرے ہونٹوں کو دوام +
رات کی خوشبوؤں کو چھو کر آئے + زیست کی تازہ دلی ہست کی ندرت لائے ۔
ان کے اک بوسے سے ہر لب میں نمو آئے گی ۔

موت اس شہر سے دزدانہ پلٹ جائیگی

ان سے ظاہر ہے کہ ان کے خیالات میں تازگی ہے اور ان کی فکر کا کینوس
کافی کشادہ ہے ۔ شگفتگی کے ساتھ نیا لہجہ اور فکر کی کشیدہ کاری ہمیں مستقبل کا اشاریہ
دیتی ہے اور ہمارے لیے ذہنی تسکین کا سبب بنتی ہے

افلاطون کا فرمان تھا کہ آرٹ کو اخلاق کا تابع ہونا چاہیے ۔ فن کی تخلیق
مملکت کے مجموعی مفاد کے مطابق ہونا چاہیے ۔ انھوں نے بادشاہ وقت کو مشورہ
دیا تھا کہ صرف ان شاعروں کو ملک میں رہنے کی اجازت دی جائے جو نکوکاری
کی تلقین کرتے ہیں ۔ اس قول میں اس وقت جان ہو تو ہو لیکن راشد کے وقت
میں یہ کلیہ مفروضہ میں بدل رہا تھا ۔ نکوکاری کی تلقین از خود کلام میں آئے تو

بہتر ہے۔ جبری طور پر ادیب و شاعر سے کوئی بات منوانا غیر فطری عمل ہے جو ظلم کے مترادف ہے۔

ن۔ م راشد کی بھرپور اور شاعرانہ شخصیت کی تصویر اہل قلم کے لیے کل چیلنج تھی لیکن آج میراجی اور راشد دونوں ہی ابھر کر سامنے آگئے ہیں اور اپنی حیثیت کا لوہا منوا کر اپنے رتبہ کا تعین کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

راشد کی شاعری خیالات اور اوصاف کے رشتے مقامی حالات سے زیادہ بین الاقوامی حالات سے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کی روایت ہماری قدیم روایت سے میل نہ کھا سکی۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ لیکن آج جبکہ نثری نظم بھی اپنا مقام بنا چکی ہے۔ راشد کے کلام کی آفاقیت مسلّم ہو گئی ہے کیا ہوا اگر ان کا زجاج اس وقت حریف سنگ نہ بن سکا۔ لیکن ان کی شاعری کی زبان نے ہماری جدید شاعری کو نئی زبان عطا کی۔ اس کا اعتراف بہر حال کرنا ہی پڑے گا۔ یہ آواز اپنے اندر تازہ خون کی سی گرمی رکھتی ہے ؎

مجھے موت آئے گی مر جاؤں گا

تجھے موت آئے گی مر جائے گی تو

وہ پہلی شب مہ شب ماہ دو نیم بن جائے گی

جس طرح ساز کہنہ کے تار شکستہ کے دونوں سرے دو افق کے کنارے کی مانند بس دور ہی دور سے تھر تھراتے ہیں اور پاس آتے نہیں۔ نہ وہ راز بات ہونٹوں پہ لاتے ہیں۔ جس نے مغنی کو دور زمان و مکان سے نکالا تھا۔ بخشی تھی خواب ابد سے رہائی۔ مجھے موت آئے گی مر جاؤں گا میں۔

لا = افسانہ میں مری مورجان والی نظم بڑی سحر آگیں ہے۔

مری مورجاں مورکم مایہ جاں ۔ رات بھر زیر دیوار ۔ دیوار کے پاؤں رینگتی سانپ لہریں بنا رہی تھی + مگر صبح ہونے سے پہلے انھوں نے جو دروازہ کھولا۔ تو میں مردہ پایا گیا۔ مرے خواب زندہ بچے تھے۔

ان کی ایک نظم اندھا کباڑی ہے۔ جس کو انھوں نے ۴ جنوری ۱۹۷۵ء کو علی باقر صاحب کے لندن والے گھر پر ایک مخصوص ادبی نشست میں اپنے انتقال سے صرف ۹ مہینے پہلے اپنے کچھ دوستوں کے اصرار پر سنایا تھا۔ انگلستان میں ان کو بڑی قدر و منزلت ملی اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی یہ آواز اردو کی شعری دنیا پر چھاتی ہی گئی۔

شہر کے گوشوں میں بکھرے ہوئے + پاشکستہ سر بریدہ خواب ۔ جن سے شہر والے بے خبر۔ گھومتا ہوں۔ شہر کے گوشوں میں روز و شب + کہ ان کو جمع کر لوں ۔ دل کی بھٹی میں تپالوں ۔ اور چھٹ جائے پرانا میل ۔ ان کے دست و پا پھر سے ابھر آئیں ۔ چمک اٹھیں لب و رخسار گردن جیسے نو آراستہ دولھوں کے دلوں کی حسرت + اور ان خوابوں کو سمت راہ ملے + خواب لے لو خواب + صبح ہوتے ہی چوک میں جا کر لگاتا ہوں صدا + خواب اصلی ہیں کہ نقلی + یوں پرکھتے ہیں کہ جیسے ان سے بڑھ کر خواب دل کوئی نہیں + خواب گر میں بھی نہیں ۔ صورت گر ثانی ہوں بس + ہاں مگر میری معیشت کا سہارا خواب ہیں ۔ صبح سے شام تک یہ اندھا کباڑی شہر کے تنگ و تاریک اور کشادہ گلی کوچوں میں خواب بیچنے تک ناکام کوشش کرتا ہے اور لوگ اس سے خواب نہیں خریدتے ۔ پھر یہ نابینا شخص

خواب مفت دینا چاہتا ہے اور پھر لوگ بدگمان ہوجاتے ہیں۔

دیکھنا یہ مفت کہتا ہے کوئی دھوکہ نہ ہو۔ ایسا کوئی شعبدہ پنہاں نہ ہو۔ گھر پہنچ کر ٹوٹ جائیں یا پگھل جائیں یہ خواب۔ اور شہر والوں کی ناقدری سے تھک ہار کر خوابوں کا یہ تاجر آواز لگاتے لگاتے سو جاتا ہے اور سوتے میں بھی اس کے لبوں پر یہی ایک صدا اور دعوت راشد نے خیال کی ندرت کو حسن بناتے ہوئے جگہ جگہ خواب بنے ہیں خواب دیکھے ہیں اور خواب تراشے ہیں۔ بس یہی خواب زندہ بچے ہیں اور زندہ رہیں گے۔ ان خوابوں کا ذکر راشد کے ہر شعری مجموعے میں ہے۔

میرے بھی ہیں کچھ خواب ہے ـ نفرت لے لو۔ موت یہ سونے کے خواب۔

یہ خوابوں کو بانٹنے والا شخص اب خود خواب وخیال ہوگیا اور ہمیشگی کی نیند سو گیا ہے۔ لیکن ان کا کلام اور اس کی معنویت کا احساس اردو ادب میں ہمیشہ رہے گا۔ صرف پتھر ہی بے غم ہے + پتھر کی ناتشنگی پر ان کی ایک نظم کے دو مصرعے شاعری کی روایت پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔

درخت ہوا کتنی تیزی سے گزری تمھارے بدن سے

کہ اس میں روایات سرگوشیاں کر رہی ہیں

ان کی ایک نظم ہے۔ جو نئے زمانے کی نئی آواز ہے۔ لیکن اس میں نامانوسیت اور اجنبیت کا احساس کہیں بھی نہیں ہوتا۔

میں تنہائی میں کر رہا تھا + پرندوں سے باتیں

میں یہ کہہ رہا تھا + پرندو نئی حمد گاؤ

کہ وہ بول + جو اک زمانے میں بھنوروں کی باہنوں پہ اٹھتے ہوئے باغ

کے آخری موسموں تک پہنچنے تھے۔ اب راستوں میں پھیلنے لگے ہیں۔ نئی حمد گاؤ۔
پرندے مگر ہمیشہ اپنے ہی عاشق
سراسر آسماں پہنچتے تھے۔

ان ہی کی زندگی میں مغنی تبسم نے حیدرآباد سے راشد نمبر نکالا تھا کچھ اور مضامین بھی لکھے گئے ہیں جو تشنہ ہیں۔ ساقی فاروقی ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان خط وکتابت بھی کافی دن تک رہی اس کا اشاریہ ملتا ہے کہ یہ دوستی ہمہ گیر اور سکون بخش تھی۔ اگر یہ سارے خطوط شایع ہوجائیں تو راشد کی شخصیت کے بہت سے پوشیدہ گوشے نمایاں ہوکر سامنے آسکتے ہیں۔ ان میں شعروادب۔ شاعروں اور ادیبوں پر تفصیلی اور معلوماتی بحثیں ہیں۔ کچھ سوالات راشد نے اٹھائے ہیں۔ کچھ جوابات ہیں۔ جن سے شعروادب کے بارے میں ان کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ن۔م راشد کے بارے میں ابھی لکھنے کو بہت کچھ ہے۔ اتنی جلد راشد ختم نہیں ہوسکتے۔ اب وقت آیا ہے کہ ان پر کچھ زیادہ ٹھوس تخلیقی کام ہو۔

راشد کی اہمیت تاریخ ساز ہے وہ بذات خود تاریخ تھے۔ وہ ایک نظامِ حیات کو بدلنے کی طاقت رکھتے تھے۔ وہ فن اور حسن کے اندر ڈوبے تھے یا نہیں لیکن آج جو انسان عرفانِ ذات کی طرف پلٹا ہے۔ جدید شاعری آج جس نہج پر گامزن ہے اس پر راشد پورے اترتے ہیں۔ ان کے یہاں نہ ازل کا سرور ہے اور نہ ابد کی فکر۔ انھوں نے شاعری میں آزاد نظم کے نام پر تجربہ کیا۔ وہ اس وقت کامیاب

نہ ہو سکا نہ سہی آج اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آئندہ اردو شاعری کی تاریخ لکھنے والا ن۔ م راشد اور میراجی کو نظر انداز نہ کر سکے گا۔

اردو نثر میں طنز و ظرافت کی روایت

(۱۸۶۹ء سے ۱۹۴۶ء تک)

اُردو ادب زیادہ پرانا نہیں ہے اور اسی لیے اردو نثر میں طنز و ظرافت کی روایت بھی کچھ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اگر اردو نثر کی عمر ۱۵۰ سال تسلیم کر لی جائے تو اردو میں طنز و ظرافت کی عمر ۷۵ سال ماننا پڑے گی یعنی اوائل انیسویں صدی میں اس کا آغاز ہوا اور اس کو جنم دینے والے وہ اشخاص تھے جن کی رگوں میں قدیم خون تھا۔ جن کے یہاں وسیع القلبی اور وسیع النظری کا فقدان تھا۔ جو قدامت کو سینے سے چمٹائے رکھنے کے عادی تھے اور جدید سے بدکتے تھے اور مے و نغمہ کو "اندوہ رُبا" کہتے تھے۔ قدیم معاشرت کی پرچھائیاں خیالات و جذبات پر حاوی تھیں۔ قدیم اور جدید کے درمیان ابھی کوئی خط نہیں کھینچا گیا تھا۔ ہماری اردو نثر اسی ہنگامی کشاکش میں پیدا ہوئی اور عرصے تک قدیم و جدید کے دام میں الجھی رہی اس دور کی دین

باغ و بہار اور فسانۂ عجائب ہیں۔

رفتہ رفتہ مغرب کا اثر زندگی کے ہر گوشے پر مرتب ہونے لگا۔ دل و دماغ کو مہمیز ملی تو سیاست بدلی۔ اخلاق و عقائد میں تبدیلی رونما ہوئی شاعری میں موضوعات نے ایک نیا روپ دھارا اور معاشرت میں تصادم و تزلزل پیدا ہوا اور اس تصادم و تزلزل ہی کی دین ہے طنز و ظرافت اور یہی طنز و ظرافت کا اصل الاصول بھی ہے۔

۱۸۶۹ء میں غالب کے خطوط اور ڈاکٹر نذیر احمد کی مراۃ العروس شائع ہوئی ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کا اجرا عمل میں آیا۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں چار نام سرفہرست ہیں۔ منشی سجاد حسین، نواب آزاد سرشار اور اکبر الہ آبادی (اکبر الہ آبادی منظوم لکھتے تھے) ان سب کی راہ ایک ہے زادِ سفر الگ الگ ہے۔ ہر ایک کی ذہنی افتاد اور علمی استعداد اور موضوع کے حدود میں فرق ہے اگر ان سب کا مطالعہ و موازنہ فنی ہیئت۔ مجموعی تاثر اور قوتِ حیات کو ترازو بنا کر کیا جائے تو یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ ان سب کے تخلیقی کارنامے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اودھ پنچ کے بارے میں رشید احمد صدیقی کی یہ تنقید کہ "وہ معاشرت میں قدامت اور سیاست میں جدیدیت کا قایل تھا اور خورشید الاسلام کی یہ رائے کہ اس کے نصب العین میں توازن کی سخت کمی تھی" قابل قبول ہے۔ یہ سب سہی لیکن زمانے کی مجبوری اور وقت کی پابندی کو بھی ذہن میں رکھ کر کوئی بات قطعیت سے کہی جانی چاہیے۔ اودھ پنچ کی ظرافت میں گہرائی کی کمی ہے وہ گاڑھی اور ثقیل ہے۔ لیکن بے نمک نہیں ہے۔ اس کی ظرافت میں قدیم معاشرت کی واضح جھلکیاں ہیں

اور جدید سیاست کی پرچھائیاں ہیں۔

اس کے طنز میں گہرائی نہیں ہے تو کیا ہوا یہ یکسر سلیقہ سے عاری کبھی نہیں ہے۔ اگر الفاظ کی بازیگری پر انگلی رکھی جا سکتی ہے تو اس کی فطری روانی کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس میں تیزی ہے زہرناکی نہیں ہے۔

ہاں کہیں کہیں یکسانیت کھٹکتی ہے لیکن اس پر بھی نظر رکھیے کہ ہر چار صفحات کے بعد فضا بدل جاتی ہے۔ الفاظ۔ موضوعات۔ خیالات اور جذبات کی فراوانی ہے اور قہقہوں کی طغیانی ہے۔ لیکن زیرِ لب مسکراہٹ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے قہقہوں کی دولت بے خیالی سے بغیر کسی ضرورت کے لٹائی جا رہی ہے۔

۳۶ سال تک اودھ پنچ نے فطرت کے خزانوں کے در کھولے ۱۹۲۰ء میں یہ بند ہو گیا۔ شیخ مختار نے ۱۹۱۵ء میں دوبارہ اس میں روح پھونکی یہاں صرف ایک نام جادی ہے اور وہ ہے مقبول حسین ظریف کا جنھیں محاکات کا شہنشاہ تسلیم کیا گیا ہے۔

وقت آگے بڑھا مغربی تعلیم کا اثر گہرا ہوا اور مغربی ادب نے تعلیم یافتہ طبقے کو ژرف نگاہی بخشی۔ قومیت کا جذبہ پیدا ہوا۔ آزادی اور جمہوریت کے تصورات ابھرے۔ ذہنی آزادی اور قومی تشخص کا احساس جاگا اور اس کے بعد اپنے تہذیبی سرمائے کو کھنگالنے اور اس کو از سرِ نو پیش کرنے کا تصور پیدا ہوا اور اس کے زیرِ اثر اردو طنز و ظرافت میں چار جاندار تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔

۱۔ خیال کو فوقیت ملی۔ ۲۔ دائرہ عمل میں وسعت آئی۔

۳۔ انگریزی فرانسیسی اور روسی ادب کے اسالیب اور موضوعات سے اردو طنز وظرافت نے اثر قبول کیا۔ ۴۔ ایک عام آفاقی اور کائناتی نقطۂ نظر وجود میں آیا یہاں سے ۱۹۴۵ء تک طنز وظرافت کے کینوس پر اچھے لکھنے والوں کے نام ابھرے جنھیں تین سمتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا رخ: یہاں سجاد انصاری۔ مہدی افادی اور قاضی عبدالغفار نظر آتے ہیں۔

سجاد نے اس کو فلسفہ دیا۔ مہدی نے بتایا کہ نثر میں شاعری کیسے کی جاتی ہے اور قاضی صاحب نے مغربی سیاست کی بیخ کنی اور مشرقی اخلاق کی صحت پر زور دیا۔

سجاد کی نثری تحریریں۔ مہدی کے خطوط اور قاضی جی کی، فرنگ اور لیلے کے خطوط اردو کے نثری ادب میں قابل قدر اضافے ہیں۔

دوسرا رخ: جب دوسری سمت نظر جاتی ہے تو سامنے آتے ہیں۔

میر محفوظ علی۔ عبدالماجد دریا بادی۔ جن میں سے پہلے کے یہاں طنز کا رنگ موّدبانہ ہے۔ شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں اس رنگ کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ موخرالذکر کے یہاں خشونت اور گریہ ہے۔

تیسرا رخ: ایک ذرا مڑکر دیکھتے ہیں تو مولانا ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ظفر علی خاں صحافی ہیں ان کی طنزیہ عبارتوں اور تحریروں نے اردو کو بہر حال کچھ دیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں شخصیت زبان اور معلومات ایک دوسرے

میں ضم ہو گئے اور اسی لیے انھوں نے جو کچھ اردو نثر کو دیا ہے اس کو کبھی بھی اور کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ علی گڑھ شملا اور کانفرنس والے آزاد بڑے جاندار طنز و ظرافت نگار ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ سب انگریز مغربیت اور مغربی سیاست کے درپے ہیں کچھ اور آگے بڑھتے ہی ہماری ملاقات ہوتی ہے ملا رموزی عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی سے۔

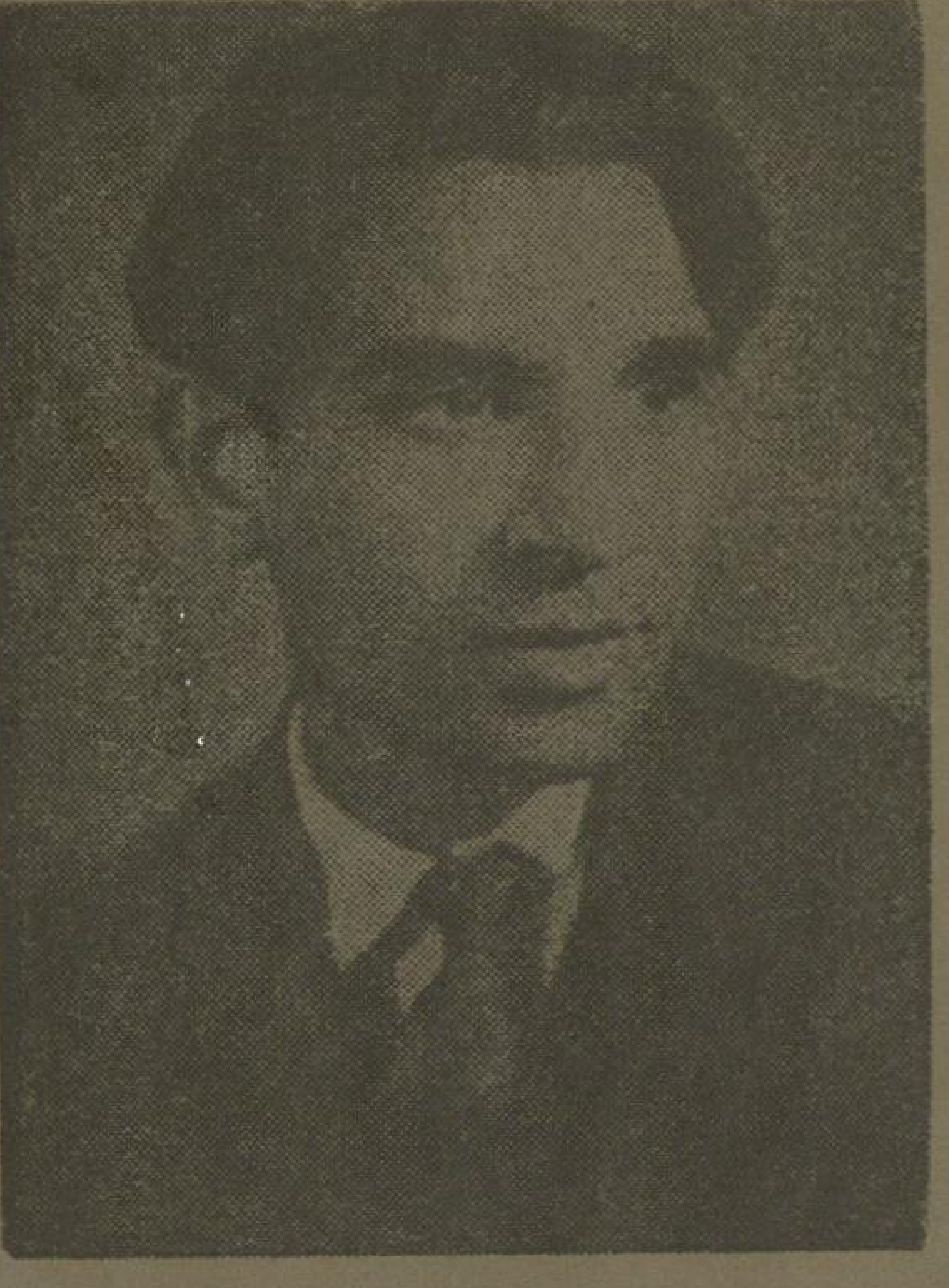
ملا رموزی۔ گلابی اردو لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے یہاں زبان کے چٹخارے تو ہیں لیکن ضبط کی کمی ہے۔

عظیم بیگ چغتائی۔ کھلنڈرے ہیں۔ واقعہ سے جو چیز وہ پیدا کر دیتے ہیں بس یہ ان کا ہی حصہ ہے۔ کولتار چمکی وغیرہ ان کے کارنامے ہیں۔ شوکت تھانوی نے طنز زبان واقعہ اور خیال سے پیدا کیا ہے۔ اس لیے وہ بڑی حد تک کامیابی کی سرحدوں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ بعد میں ان کی کثرت نے ان کو مارا برے بھلے اور شیش محل نے اردو طنز و ظرافت میں اپنا منفرد مقام بنا لیا ہے۔

وقت کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ گزر جاتا ہے وقت گزرا کچھ اور لکھنے والے پیدا ہوئے اور اب جو نام ہمارے سامنے آتے ہیں وہ فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی اور پطرس کے ہیں۔ فرحت اللہ محاوروں پر عبور رکھتے ہیں ان کی زبان پر حرف زنی کرنا کفر ہے ان کی زبان دلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ واقعہ نگاری میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ مرقع بنانے میں ان کا ثانی آج تک پیدا نہ ہوا۔ آخری وصیت، نذیر احمد کی کہانی اور پھول والوں کی سیر ان کے تخلیقی کارنامے ہیں۔ رشید احمد

صدیقی۔ بات میں بات نکالنا ان کا فن ہے۔ قول محال کی برجستگی کے لیے اردو نثر ان کی ہمیشہ ممنون رہے گی۔ یہ اس چیز پر طنز کرتے ہیں جو فرد کی آزادی۔ سکون اور آسودگی میں حارج ہوتی ہے جیسے پولیس وغیرہ۔

پطرس۔ روزمرہ زندگی پر عبور رکھتے ہیں۔ روزمرہ زندگی کو ڈرامائی انداز میں پطرس سے زیادہ اچھی طرح کوئی پیش نہیں کر سکا ہے۔ وہ تماشہ دکھاتے ہیں اور مزہ یہ ہے کہ خود تماشہ نہیں بنتے۔ ان کے یہاں واقعیت۔ حسن۔ تعمیر اور دھیمی ظرافت قدم قدم پر نمایاں ہے اور اسی میں ان کے اتنا کم لکھ کر ہمیشہ زندہ رہنے کا راز مضمر ہے۔ ان کے یہاں خوشگوار طنز ہے اور طنز میں گہری انسانیت کے پہلو نمایاں ہیں۔ امتیاز علی تاج کا چچا چھکن اردو ظرافت میں اضافہ ہے۔ یہ JEROME.K.JEROM کا چربہ ہے۔ ان کا چربہ اتارنے کے فن میں دوسرا نمبر ہے۔ محمد حسین آزاد چربہ اتارنے میں سرفہرست ہیں۔ ان تمام لکھنے والوں نے اپنے ماحول کی بیباک اور بے لوث ترجمانی کی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ سرشار کے زمانہ میں اس فن کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ ابوالکلام اور قاضی عبدالغفار نے اسے حقائق سے لبریز کیا۔ فرحت اللہ نے اسے پیارا کیا۔ رشید صاحب نے اسے خوش سلیقگی سے برتا اور پطرس نے اسے زیر لب تبسم کی شان محبوبی عطا کی۔



یاور علیگ